مجلس ادارت

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد

۳۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی ۴۔ ضیاء الدین اصلاحی

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۴۸ ماہ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۲ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۹۱ء عدد ۶

مضامین

شذرات ضیاء الدین اصلاحی ۴۰۲ - ۴۰۴

مقالات

حافظ شیرازی کی شاعری میں سلوک ڈاکٹر سید وحید اشرف کچھوچھوی۔ ۴۰۵ - ۴۱۵
صدر شعبۂ عربی، فارسی، اردو مدراس یونیورسٹی۔

تحریک عصبیہ اندلسیہ کا ارتقاء ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی۔ ۴۱۶ - ۴۳۶
صدر شعبۂ عربی کالی کٹ یونیورسٹی۔

امام ابوسعید اصطخری عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین ۴۳۷ - ۴۴۳

وقت کہتے ہیں جسے اہل زمیں کیا راز ہے؟ جناب محمد بدیع الزماں پھلواری ۴۴۴ - ۴۵۰

اخبار علمیہ ع۔ص ۴۵۱ - ۴۵۴

آثار علمیہ و تاریخیہ

عدالت میں مولانا حمید الدین فراہی کا حلفی بیان ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اسلام آباد ۴۵۵ - ۴۷۱

معارف کی ڈاک

مکتوب لاہور جناب شیخ نذیر حسین مدیر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور پاکستان ۴۷۲

مکتوب کلکتہ پروفیسر مقبول احمد کلکتہ ۴۷۳

مکتوب احمد آباد پروفیسر محی الدین۔ بمبئی والا احمد آباد ۴۷۴

ادبیات

خمسۂ نعت جناب محمد عبد الرحمٰن سعید صدیقی شکاگو۔ امریکہ ۴۷۵

مطبوعات جدیدہ ع۔ص ۴۷۶

شذرات

اسلام ایک عالمگیر اور دائمی مذہب ہے، اور قرآن مجید تمام انسانوں کے لیے خدا کا آخری پیغام ہے، اس کا حامل رحمۃ للعالمین تھا، آپؐ خدا کی رحمت اور پیام کو عام کرنے کیلئے دنیا میں تشریف لاتے تھے، آپؐ کی رسالت ہر قوم و ملک، ہر خطہ و علاقہ اور ہر طبقہ و جماعت کے لیے تھی، آپؐ کی بعثت کالے گورے، آبی و خاکی سب کے لیے ہوئی تھی، اس لیے آپؐ زندگی بھر اپنے مشن کی تکمیل میں لگے رہے، اور آپؐ نے خدا کے پیغام و ہدایت کو پہونچانے میں کوئی کور کسر باقی نہیں رکھی، اور اپنے بعد ایک ایسی امت چھوڑی جو ہمیشہ آپؐ کے مشن کو جاری رکھے، اور دنیا کا کوئی گوشہ اور کونا بھی ایسا نہ رہ جائے جہاں آپ کے پیغام کا غلغلہ نہ مچ جائے۔

آج جو لوگ نبی امیؐ پر ایمان لانے اور اس کے امتی ہونے کے مدعی ہیں، کیا وہ آپ کے پیغام و ہدایت کو عام کرنے اور نوع انسانی کے ہر طبقہ و گروہ تک آپؐ کی دعوت کو پہونچانے کا کام انجام دے رہے ہیں، یا عقیدت و محبت کے صرف رسمی طریقوں کے اظہار اور نعرۂ رسالت بلند کر لینے ہی کو آپ کی بارگاہ میں نذرانہ خیال کرتے ہیں، اور میلاد النبیؐ کے جلسوں میں لچھے دار تقریریں کر دینے اور آپؐ کے فضائل و مناقب بیان کرنے ہی کو کافی سمجھتے ہیں، یہ مقام عبرت ہے کہ جن لوگوں کو آپؐ کا پیغام دشت و جبل ہر جگہ پہونچانا تھا ان میں باہم جنگ و جدال اس لیے جاری ہے کہ آپؐ کی رسمی و ظاہری عقیدت کے کون سے طریقے اختیار کیے جائیں اور کن کو چھوڑا جائے، انھیں خُلق محمدیؐ کا نمونہ پیش کرنے اور آپؐ کی تعلیم و ہدایت سے دنیا کو واقف کرانے سے کوئی سروکار نہیں رہ گیا ہے، اس سے بھی بڑھ کر افسوسناک امر یہ ہے کہ رسولؐ کی محبت و عقیدت کا دم بھرنے والے اسی کے نام پر مسلمانوں میں افتراق و انتشار پیدا کر کے شیرازۂ ملت کو تار تار کر رہے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں پر بھی غیر مسلموں کو رسول عربیؐ کا پیغام پہونچانے کی ذمہ داری عائد

ہوتی تھی، انھوں نے سینکڑوں برس تک ہندوستان پر حکمرانی کی، یہاں تاج محل اور اس جیسی متعدد حسین اور پر شکوہ عمارتیں بنوائیں، اس کو علمی، تعلیمی، تہذیبی، تمدنی، زرعی، اقتصادی اور سماجی حیثیت سے ترقی دے کر اسے جنت نشان بنا دیا، ان کے قدم پڑتے ہی یہ سرزمین گل و گلزار ہو گئی، اور انھوں نے اس کے چپے چپے پر اپنی یادگاریں چھوڑیں، لیکن وہ یہاں کے باشندوں کو پیغام محمدیؐ اور اسلامی تعلیم سے واقف کرانے کے کام سے غافل رہے، اور اپنے اخلاق و کردار کا کوئی تاج محل نہیں تعمیر کر سکے جو ان کی تاریخ کا ایک بڑا المیہ ہے، اور اب جبکہ حکومت و اقتدار ان کے ہاتھوں سے چھین گیا ہے تب بھی وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کی تکمیل سے بے پروا ہیں۔

ہندی اس ملک کی سرکاری زبان ہو گئی ہے، شمالی ہند میں حکومت کا سارا کاروبار اسی میں ہو رہا ہے، اسکولوں اور کالجوں میں یہی زبان ذریعۂ تعلیم ہے، اس لیے ملک کے دوسرے شہریوں کی طرح مسلمان بھی اس کی تحصیل سے غافل نہیں ہیں، انھیں معلوم ہے کہ ہندی نہ سیکھ کر وہ اپنا ہی نقصان کریں گے، اس سے ان کی پس ماندگی بڑھے گی اور وہ قومی زندگی میں دوسروں سے پیچھے ہو جائیں گے لیکن تبدیل شدہ حالات میں ان کے لیے یہ بھی ضروری ہو گیا ہے کہ وہ ہندی میں تصنیف و تالیف کا مستقل لائحۂ عمل بنائیں، اور اپنے اس سرمایہ کو جو اردو، فارسی اور عربی زبانوں میں ہے، ملک کی سرکاری زبان میں منتقل کریں، کیونکہ ہندوؤں کے ایک بڑے طبقہ کو اردو زبان سے خواہ مخواہ کد ہو گئی ہے، اور وہ ملک کے اس قابل فخر تہذیبی سرمایہ کو مٹا دینے کے درپے ہے، اس میں خود اس ملک کا نقصان ہے

لیکن ؎ سمجھائے کون بلبل غفلت شعار کو : محدود کر لیا ہے چمن تک بہار کو

مسلمان زیادہ تو اپنی سہولت پسندی اور کسی حد تک واقعی مجبوری کی بنا پر اردو سے ناواقف ہو کر خود اسلامی تعلیم و ہدایت سے بے بہرہ ہوتے جا رہے ہیں جبکہ غیر مسلموں کو بھی اسلام کی

عالمگیر ہدایت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دائمی پیغام سے آشنا کرنا ان کا مذہبی فریضہ
تھا، جس کو وہ ادا نہیں کر سکے۔ ....

.... اس لیے نئے حالات کا لازمی
اقتضا یہ ہے کہ اسلامی علوم و فنون اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات کو
ہندی زبان میں منتقل کرنے کا کام تیزی سے کیا جائے، کیونکہ آپ کی دعوت و پیغام کو غیر مسلموں
تک پہونچانے پر مسلمان من جانب اللہ مامور ہیں، لیکن اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ
وہ اردو سے دامن کش ہو جائیں، اور ان کے جو ادارے اس کی ترقی و ترویج کے لیے
قائم کیے گئے ہیں وہ اپنا کاروبار بند کر دیں، البتہ ایسے اداروں کا قیام ناگزیر ہے جو ہندی
میں تصنیف و تالیف کا کام یکسوئی سے انجام دیں، یا پھر اصلاحی و دینی جماعتوں کو اپنے
دائرہ میں یہ کام بھی شامل کر لینا چاہیے۔

افسوس ہے کہ اردو کے ایک عاشق و شیدائی جناب صباح الدین عمر کا انتقال ہو گیا، وہ
لکھنؤ کی روایات کے بڑے دلدادہ اور اس کی تہذیب و ثقافت کا نمونہ تھے، وہ سرکاری ملازم
تھے، یوپی کے محکمۂ اطلاعات کے اردو ماہنامہ "نیا دور" کے ایڈیٹر بھی رہے، اتر پردیش اردو اکادمی
کے قیام کے بعد اس کے سکریٹری ہوئے اور اس کا رسالہ اکادمی ان کی ادارت میں شائع ہوا
ریٹائرڈ ہونے کے بعد اردو اکادمی اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے برابر رکن رہے اور انکو
اپنے مشوروں اور تجربوں سے بڑا فائدہ پہونچایا، طبعاً شریف اور مخلص تھے، دوسروں کی
مدد کر کے خوشی محسوس کرتے تھے، اللہ تعالیٰ اردو کے اس عاشق و خادم کی مغفرت فرمائے آمین!!

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے بمبئی جیسے ہنگامہ خیز شہر میں رہ کر ہندوستان
کی اسلامی تاریخ اور دوسرے دینی موضوعات پر درجنوں محققانہ کتابیں لکھیں جن کے
عربی ترجمے بھی شائع ہوئے، دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ نے انکیں اعزازی رفیق منتخب کیا ہے،

مقالات

خواجہ حافظ شیرازی کی شاعری میں سلوک

از ڈاکٹر سید وحید اشرف کچھوچھوی

(۲)

گذشتہ شمارہ میں حافظ کی جو غزل زیر بحث آئی تھی اس کے ضمن میں عرض کیا گیا تھا
کہ اس کی تائید میں ان کے دیوان سے بہت سے اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن طوالت
کے خوف سے انہیں قلم انداز کیا جاتا ہے مگر بعد میں خیال ہوا کہ اس کی مکمل وضاحت کیلئے
دیوان حافظ سے مزید اشعار پیش کر دینا مناسب ہوگا۔

خواجہ حافظ نے اس بات پر بار بار زور دیا ہے کہ یہ دنیا انسان کا مقصود نہیں
ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ دنیا ناپائدار ہے اور انسان عشق الٰہی
کے ذریعہ زندگی جاوید حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن یہ راہ بہت کٹھن ہے اس کے لیے بہت مضبوط
ارادہ ہونا چاہیے یہاں تک کہ اس راہ میں جان کی بازی بھی لگانی پڑتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں تو حافظ "رضا بداده بده وز جبین گره بکشای"
کہتے ہیں اور کہیں کہتے ہیں کہ "فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم"۔ یہ دو مختلف
افکار بظاہر بالکل متضاد ہیں۔ ان میں کیا مطابقت ہے؟ اور کون سی تعلیم
قابل قبول ہے؟

مصرعہ رضا بداده بده ..... الخ پر مفصل بحث پہلے گذر چکی ہے کہ اس کا مقصد

یہ ہے کہ انسان کے اختیار کی ایک حد ہے۔ وہ اپنے ہر ارادے کی تکمیل نہیں کر سکتا لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں برآمد کیا جاسکتا کہ انسان کو ارادہ اور عزم و حوصلہ ہی ترک کر دینا چاہیے۔ کیونکہ اس کو نہیں معلوم کہ اس کی قسمت میں کیا ہے اس لیے اپنے مقسوم کے حصول کیلئے اسے عزم و ہمت سے کام لے کر جد و جہد سے باز نہیں رہنا چاہیے۔ فلک را سقف بشگافیم اسی عزم و ہمت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کسی بڑی سے بڑی مہم کو سر کرنے میں اسے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور عزم اور مقصود کو بلند رکھنا چاہیے پھر بھی اگر وہ ناکام ہو جائے تو اس ناکامی پر اسے رنجیدہ اور غمزدہ اور مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

اب ہم ذیل میں وہ اشعار پیش کرتے ہیں جن میں انسان کے مقصود حیات کی طرف اشارہ ہے اور یہ کہ یہ دنیا اس لائق نہیں کہ اسے مقصود حیات قرار دیا جاسکے اسلیئے خواجہ صاحب پہلے عزلت نشینی اور ترکِ تعلقات کی تعلیم دیتے ہیں۔

نشیمنِ تو نہ این کنجِ محنت آباد است　　یہ غمکدہ نہیں ہے ترا جائے نشیمن
ترا ز کنگرۂ عرش میزنند صفیر　　تجھے تو کنگرۂ عرش پہ بلاتے ہیں
ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتادہ ست　　تو دامگاہ میں پھنس کے ہوا ہے کیوں برباد
فریبِ عشوۂ حسن از جہانِ پیر مخور　　فریبِ عشوۂ حسنِ جہانِ پیر نہ کھا
کہ ہر کہ کرد بہ وی اختلاط ناشاد ست　　جو عاشق اس کا ہوا، ہو گیا وہی ناشاد
حافظا ترکِ جہاں گفتن طریقِ خوشدلی ست　　خوشدلی حافظ ہے بیشک ترکِ دنیا کا مآل
تا نہ پنداری کہ احوالِ جہانداراں خوش است　　خواب میں اہلِ دول ہیں اور ناخوب انکے حال
فقر اگر رنج و محنت است اما　　فقر میں گرچہ رنج و محنت ہے
گنجِ عزت بکنجِ عزلتِ او ست　　اس کے کوچہ میں گنجِ عزت ہے

جمیلہ ایست عروسِ جہان ولی ہشدار　　ہے عروسِ جہاں حسین بہت
کہ این مخدّرہ در عقد کس نمی آید　　زیرِ فتا بو مگر نہیں آتی
بچشمِ عقل ببیں در جہانِ پُر آشوب　　عقل کی آنکھ سے دنیائے پُر آشوب کو دیکھ
جہان و کارِ جہان بی ثبات و بی محل است　　اسکو حاصل ہی نہیں ہے کوئی بنیاد و ثبات
از سرِ دنیا گذشتی غم مخور　　ترک دنیا کا کرو ہرگز نہ غم
خوش بخور ہم خوش بدار ایام را　　خوش رہو، رکھو نہ فکرِ کیف و کم
گنجِ زر گر نبود کنجِ قناعت باقی ست　　نہ سہی زر نہ سہی، گنجِ قناعت تو ہے
آنکہ آن داد بشاہان بگدایان این داد　　وہ دیا شاہ کو اس نے تو گدا کو یہ دیا

ترکِ دنیا اور عزلت کے ساتھ مرشد کی نگرانی میں دل کے زنگ کو صاف کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ خدا کے عشق کی جلوہ گاہ بن سکے۔ اب سالک کو صرف اپنے مرشد سے سروکار رکھنا ہے۔ اس کے عشق اور اس کی رہنمائی میں سلوک کی منزلیں طے ہو سکتی ہیں۔ اس راہ میں استقامت کی ضرورت ہے۔

ہر کرا آئینہ صافی نشد از زنگ ہوا　　آئینۂ دل جس کا نہ ہوا صاف و صیقل از زنگِ ہوا
دیدہ اش قابلِ رخسارۂ حکمت نبود　　محرومِ نظر، بے عقل و ہنر، بے حکمت و دانش ہی وہ رہا
مرا گدای تو بودن ز سلطنت خوشتر　　تیرا گدا رہنا مجھے ہے سلطنت سے خوب تر
کہ ذل و جور و جفای تو عز و جاہِ من ست　　جور و ذلت گر ملے تجھ سے تو وہ اعزاز ہے
کلاہ و دولتِ خسرو کجا بچشم آید　　مجھ کو تو بھاتی ہی نہیں آنکھوں میں تاجِ خسروی
کہ خاکِ کوی شما عزت و کلاہِ من ست　　ہے تاج خاکِ رہ تری مجھ کو اسی پر ناز ہے
آئینۂ زنگار را از صیقلِ تقوی پاک کن　　زنگِ دل تقویٰ کے صیقل سے کردم پاک و صاف

پاک بنگر اندر آن آیینہ ای جانا نہ را — پھر تم اس آئینہ میں دیکھو گے روئے یار کو

ایک غزل کے بیشتر اشعار سلوک، عشقِ الٰہی اور عشق و اطاعتِ پیر کی طرف اشارہ کرتے ہیں:۔

بعزم مرحلہ عشق پیش نہ قدمی — عشق کی راہ میں ہمت سے قدم رکھ اے دوست
کہ سودہا بری از این سفر توانی کرد — سن لے تو پائے گا اس راہ میں نفع بسیار
بیا کہ چارۂ ذوقِ حضور و نظمِ امور — ذوق و مستیِ حضور اور سبھی نظمِ امور
بفیض بخشی اہل نظر توانی کرد — نظرِ شاہِ طریقت سے کھلیں گے اسرار
گل مراد تو آنگہ نقاب بگشاید — پاؤگے گوہرِ مقصود یقیناً اک روز
کہ خدمتش چون نسیم سحر توانی کرد — اس کی خدمت کو ہمیشہ رہو لیکن تیار
تو کز سرای طبیعت نمی روی بیرون — ہاں اگر زنگِ طبیعت کو کیا تم نے نہ دور
کجا بکوی حقیقت گذر توانی کرد — دیکھ سکتے نہیں تم روئے حقیقت زنہار
دلا ز نور ریاضت گر آگہی یابی — تو اگر جان لے یہ نورِ ریاضت کیا ہے
چو شمع خندہ زنان ترک سر توانی کرد — شمع کی طرح تو سر اپنا کٹا دے یکبار
جمال یار ندارد نقاب و پردہ ولی — کوئی پردہ نہیں ہے یار کے رُخ پر اے دوست
غبار رہ بنشان تا نظر توانی کرد — دیکھ سکتا ہے تو گر دور کرے رہ کا غبار
ولی تو تا لب معشوق و جام میخواہی — عشق کا تجھ کو ہے سودا تو سمجھ لے اے دل
طمع مدار کہ کار دگر توانی کرد — تو کسی کار سے رکھ سکتا نہیں ہے سروکار
گر این نصیحت شاہانہ بشنوی حافظ — پندِ شاہانۂ حافظ کو جو تم رکھو گے یاد
بشاہراہ طریقت گذر توانی کرد — ہوگے شہراہِ طریقت کے تمہیں شاہسوار

عزلت اور گوشہ نشینی کا مقصد یہ ہے کہ یکسو ہو کر مرشد کی نگرانی میں ریاضت و مجاہدہ کیا جائے اور اپنے اندر صفات حسنہ پیدا کیے جائیں۔ اپنے نفس کو خدا کی مرضی کے تابع بنایا جائے اور نفسانی خواہشات سے اپنے کو بچایا جائے۔ دنیا کی طمع سے اپنے کو دور رکھا جائے اور جب طبیعت اخلاقی اعتبار سے بالکل مضبوط ہو جائے اور آئینۂ دل زنگ سے صاف ہو جائے اور اتنی روحانی قوت حاصل ہو جائے کہ جلوت کی زندگی میں اس کا دل آلودگی سے ملوث نہ ہو سکے اور دنیا کا لالچ اسے بتلائے ہوا و ہوس نہ کر سکے تو اب اسے عزلت سے باہر آنا چاہیے لیکن سماجی زندگی میں نئی نئی مشکلات اور نئے نئے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حاسدوں کا حسد اور دشمنوں کے آزار کو صبر کے ساتھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ دشمنوں کے آزار کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ خاصانِ خدا کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں اور انہیں بھی اپنا ہی جیسا سمجھتے رہیں۔ حالانکہ صوفیہ نے بار بار تنبیہ کیا ہے مثلاً مولانا روم کا صرف ایک شعر یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

کار پاکاں برقیاسِ خود مگیر — گرچہ باشد در نوشتن شیر، شیر

یعنی پاک لوگوں کو اپنے اوپر مت قیاس کرو، اگرچہ جنگل کے شیر کو بھی شیر (یعنی دودھ) لکھتے ہیں اور تحریری شکل میں دونوں یکساں ہیں لیکن جنگل کے شیر کو کوئی دودھ نہیں سمجھ سکتا۔ پاک لوگ راہِ طریقت کے شیر ہیں اور عام لوگوں سے بہت بلند ہوتے ہیں۔

حافظ نے اپنی سماجی زندگی پر کوئی تفصیلی روشنی نہیں ڈالی ہے۔ البتہ جگہ جگہ اپنی مصیبتوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور کئی اشعار میں یہاں تک کہا ہے کہ موت بہتر ہے لیکن پھر کہتے ہیں کہ حافظ اس راہ میں صبر کرو۔ صبر ہی سے تم کو گوہرِ مراد ملے گا۔ لوگوں کے حسد و عناد کی طرف حافظ کے بعض اشعار میں اشارے ملتے ہیں مثلاً

برندی شہرہ شد حافظ پس از چندین ورع اما
با وصف زہد و ورع و صفا مشہور ہے حافظ رند زمن

چہ غم دارم کہ در عالم امین الدین حسن دارم
لیکن مجھے کیونکر غم ہو کہ جب ہے دوست امین الدین حسن

صبر بر جور رقیبان نکنم گر چہ کنم
کیا کروں جور و ستم پہ نہ کروں صبر اگر

عاشقان را نبود چارہ بجز مسکینی
صبر و مسکینی ہی ہے شیوۂ عاشق حافظ

لیکن ظاہر ہے کہ یہ سارے مصائب جلوت یعنی سماجی زندگی ہی میں ہو سکتے ہیں۔ اور ان پر صبر کرنا اور قناعت و توکل بلکہ خوش دلی کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہی سالک کا شیوہ ہوتا ہے۔ وہ کسی سے انتقام نہیں لیتا۔ وہ تسلیم و رضا کی منزل میں ہوتا ہے اور اس طرح اس کے اخلاق اور اس کے درجات میں بلندی آتی ہے۔ سماجی زندگی میں حافظ نے اپنے مصائب کی طرف جو اشارے کیے ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ سالک کو راہِ طریقت میں اس طرح کے مصائب برداشت کرنے کے لیے آمادہ رہنا چاہیے۔ یہی نہیں بلکہ جلوت کی زندگی میں دوسروں کے ساتھ نیک سلوک، تلطف و مدارا، دوسروں کی مدد، دل آزاری سے بچنا، خدمت خلق، بدی کا بدلا نیکی سے دینا وغیرہ یہ ساری اخلاقی تعلیمات سلوک ہی کا حصہ ہیں جو دیوان حافظ میں موجود ہیں جن کے اعادے کی یہاں ضرورت نہیں ہے یہاں ہم صرف ایک غزل پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جس سے سماجی زندگی میں حافظ کی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔

کارم ز دور چرخ بسامان نمی رسد
یہ چرخ ہے روز و شب گرداں حاصل نہیں ہے کچھ ساماں

خون شد دلم ز درد و بدرمان نمی رسد
ہے خون یہ دل کا داماں اور درد ہے اسکا بے درماں

چون خاک راہ پست شدم ہمچو باد و باز
یوں پست خاکِ راہ ہوا یا گرد زمیں ہمراہ ہوا

تا آبروی نمی رودم نان نمی رسد
پھر بھی ہے یہ حالِ زار مرا، عزت کے عوض ملتی ہے دو نان

از دستبرد جور زمان اہل فضل را
یہ جور زماں کے ہیں خوگر، ہیں اہل فضل احقر ابتر

این غصہ بس کہ دست سوی جان نمی رسد
اس زیست سے ہے مرنا بہتر جیتے ہیں تو یہ ہے سختی جاں

میرم ز جان خود بدل راستان ولی
مجھکو نہیں اب امید بہی، ہوں جان سے سیر اے مرد ہی

بیچارہ را چہ چارہ کہ فرمان نمی رسد
ہے شام و سحر بس فکر یہی، آتا ہے اجل کا کب فرماں

تا صد ہزار خار نمی روید از زمین
جب خاک سے سو کانٹے اگتے اور پاؤں میں رہرو کے چبھتے

از گلبنی گلی بہ گلستان نمی رسد
اک شاخ سے پھول ہیں تب آتے، اب یہ ہے حالِ چمنستان

یعقوب را دو دیدہ ز حسرت سفید شد
اب شہر کا ہے یوں حالِ دگر یعقوب ہوئے بے نور بصر

آوازہ ای ز مصر بہ کنعان نمی رسد
لیکن ہے کون کہ اسکی خبر لے جائے مصر سے تا کنعان

پی پارہ ای نمیکنم از ہیچ استخوان
ہڈی سے گوشت جو میں نوچوں اور پارۂ گوشت اگر کھاؤں

تا صد ہزار زخم بہ دندان نمی رسد
کتنے اور کیسے کیا لکھوں، ہوتے ہیں مرے زخم دنداں

از حشمت اہل جہل بکیوان رسیدہ اند
شہرہ ہے ان کا تا کیواں جو اہل جہل ہیں اور ناداں

جز آہ اہل فضل بکیوان نمی رسد
اور اہل فضل ہیں یوں نالاں، آہ انکی پہنچی ہے کیواں

صوفی بشوی زنگ دل خود بآب می
دل سے تو دھو دے زنگ ریا، اے صوفی دل کو بخش صفا

زین شست و شوی خرقہ بہ غفران نمی رسد
دھونے سے خرقہ مگر دریا، حاصل نہیں ہوگا تجھے غفراں

حافظ صبور باش کہ در راہ عاشقی
حافظ ہے صبر ترا شیوہ، ہر گام یہ موت کا ہے خطرہ

ہر کس کہ جان نداد بجانان نمی رسد
گر راہِ عشق میں جان فدا تب ہوگا تجھے وصلِ جاناں

تمام جور و جفا اور ریاضت و مجاہدہ کی مشقتیں برداشت کرنے کے باوجود سالک کو تجلیات الٰہی کا مشاہدہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے لیے اسے مطلق بیقرار نہ ہونا چاہیے یہ صرف خدا کے فضل پر موقوف ہے اور اسے خدا کے فضل کا امیدوار رہنا چاہیے اور

مایوس نہ ہونا چاہیے۔ یہاں اسے صرف رضائے الٰہی کو مقصود سمجھ کر استقامت کی ضرورت ہے۔

تو عمر خواہ و صبوری کہ چرخ شعبدہ باز   صبر کر صبر کہ پیرِ فلکِ شعبدہ باز
ہزار بازی ازین طرفہ تر بر انگیزد   اس بھی لاکھوں گنا فتنے بپا کرتا ہے

طریق عشق پُر آشوب و فتنہ است ای دل   اے دل طریق عشق پُر آشوب ہے، سنبھل
بیفتد آنکہ درین راہ با شتاب رود   عجلت پسند راہ میں گرتا ہے منہ کے بل

گرت چو نوح نبی صبر ہست در غم طوفاں   غم طوفاں میں تم کو صبر ہے گر نوح کی مانند
بلا بگیرد و کام ہزار سالہ برآید   بلا ٹل جائیگی اور مقصد صد سالہ پاؤ گے

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نکرد   کون ہوا ہے ایسا عاشق جس پہ چشم کرم نہیں
ای خواجہ درد نیست و گر نہ طبیب ہست   دردِ عشق نہیں ہے خواجہ ورنہ طبیب تو حاضر ہے

صبر کن حافظ بسختی روز و شب   صبر کر حافظ بسختی روز و شب
عاقبت روزی بیابی کام را   عاقبت پائے گا تو مقصود سب

گر باد فتنہ ہر دو جہان را بہم زند   فتنے کی ہوا سے دونوں جہاں ہو جائے جو برہم ہونے دو
ما و چراغ چشم رہِ انتظار دوست   آنکھوں کو چراغ راہ کیے ہم ہیں اور راہ جاناں ہے

ولا طمع مبر از لطفِ بی نہایت دوست   رکھ نظر نہ دوست کے لطف بے نہایت پر
چو لاف عشق زدی سر بباز چابک و چست   لاف عشق ہے تجھے تو جان و سر کا سودا ہے

حافظ بار بار کہتے ہیں کہ بغیر مرشد کی توجہ اور عنایت کے یہ پُر خطر راستہ طے نہیں ہو سکتا۔ اس کی طرف پہلے ایک غزل کے ایک شعر میں اشارہ ہو چکا ہے

بیا کہ چارۂ ذوقِ حضور و نظم امور   بہ فیض بخشی اہل نظر توانی کرد

اس لیے مرشد کی خدمت لازم ہے۔

گل مرادِ تو آنگہ نقاب بگشاید   کہ خدمتش چو نسیم سحر توانی کرد

اس ضمن میں چند شعر اور پیش ہیں:-

ہر رہروی کہ رہ بحریم درش نبرد   رہ حریم درِ پیر کو جو پا نہ سکا
مسکین بریدہ وادی و رہ در حرم نداشت   بھٹک کے رہ گیا پہنچا نہ وہ حدودِ حرم

دولت از مرغ ہمایوں طلب و سایۂ او   سایۂ مرغِ ہما حامل دولت ہے فقط
زانکہ با زاغ و زغن شہپر دولت نبود   سایۂ زاغ و زغن ہیچ ہے اے حافظ ہیچ

صبر و استقامت اور تسلیم و رضا کے بعد جب گوہر مقصود ملتا ہے اس وقت سالک کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اس کا بیان حافظ کے اس طرح کے اشعار میں ہے۔

فلک غلامی حافظ کنون بطوع کند   آسمان بھی ہو گیا ہے اب تو حافظ کا غلام
کہ التجا بہ درِ دولتِ شما آورد   کیونکہ وہ لایا در دولت پہ تیرے التجا

آخر میں سالک فنافی التوحید کے مقام میں پہنچتا ہے۔ اب اسے صوفی کہتے ہیں۔ یہ مقام حیرت ہے۔ اسی کو وحدت الوجود کہتے ہیں یا وحدت الشہود۔ حافظ نے اپنی چند غزلوں میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور بہت سے اشعار بھی اسی معنی کے حامل ہیں۔ ذیل میں دو غزلیں نقل کی جاتی ہیں۔

عشق تو نہالِ حیرت آمد   ہے عشق ترا نہالِ حیرت
وصل تو کمالِ حیرت آمد   اور وصل ترا کمالِ حیرت

بس غرقۂ وصل حال کا خر   کتنے ہوئے حالِ وصل میں غرق
ہم با سر حالِ حیرت آمد   انجام با سر حالِ حیرت

نی وصل بماند و نہ واصل	نے وصل وہاں ہے اور نہ واصل
آنجا کہ خیالِ حیرت آمد	آتا ہے جہاں خیالِ حیرت
از ہر طرفی کہ گوش کردم	کانوں میں مرے ہر اک طرف سے
آوازِ سوالِ حیرت آمد	آئی آوازِ سوالِ حیرت
آن دل بنما کہ در رہِ او	اس راہ میں کون سا وہ دل ہے
بر چہرہ نہ خالِ حیرت آمد	رخ پہ نہ ہو جس کے خالِ حیرت
شد محترم از کمالِ عزت	عزت کا کمال اس کو حاصل
آنجا کہ جلالِ حیرت آمد	طاری ہے جس پہ جلالِ حیرت
سرتا بقدم وجود حافظ	سرتا بقدم وجودِ حافظ
در عشق نہالِ حیرت آمد	ہے عشق سے اک نہالِ حیرت

رسیدہ ام بمقامی کہ لامکان آنجاست	میں پہنچا ہوں وہاں اے دوست جسکو لامکاں کہیے
نہ نامِ روی زمین و نہ آسمان آنجاست	زمیں کہیے نہ اسکو اور نہ اس کو آسماں کہیے
دو دیدہ باز مکن در روانش، دو لب مکشا	نہ کھول آنکھیں وہاں پر اور نہ ہرگز لب کشائی کر
نہ تابِ دیدن و نی طاقتِ بیان آنجاست	بصر کو بے بصر اور نطق کو واں بے زباں کہیے
بوادی ای کہ گذشتم نہ جای چون و چرا است	نہیں گنجائش چون و چرا ہے میں جہاں پر ہوں
نہ صورت است و نہ شکل و نہ جسم و جان آنجاست	نہ کہیے صورت و شکل اور نہ اسکو جسم و جاں کہیے
چرا تو عاشقِ آن گل نمیشوی بلبل	تو ایسے پھول پہ عاشق نہیں ہوتا ہے کیوں بلبل
کہ نی بہار کند گاہ و نی خزان آنجاست	گل رعنا وہ جسکو بے بہار و بے خزاں کہیے
خطاست کلمۂ منصور در رہِ وحدت	خطا کی آپ نے منصور بیشک راہِ وحدت میں

چگونہ صوتِ لب و جنبشِ زبان آنجاست	مجالِ لب کشائی آپنے کیوں کی وہاں؟ کہیے
بگردِ خانۂ محبوب خود مرو حافظ	نہ جائیں آپ یہ ہے نیم شب بیدار درباں ہے
کہ نیم شب شد و بیدار پاسبان آنجاست	مقامِ خانۂ محبوب حافظ کیا ہے؟ ہاں کہیے

ہم نے اختصار کے ساتھ حافظ کے اشعار سے مراتبِ سلوک پر استشہاد کیا ہے نہیں اشعار سے مزید تفصیل بھی بیان کی جا سکتی ہے۔ پہلا مرتبہ جو عزم و ارادہ کا ہے اسے توبہ بھی کہہ سکتے ہیں پھر ورع، عشق، زہد، صبر، شکر، استقامت، رجا، رضا، توکل، تجرید، تفرید وغیرہ درجات کا تعین کر سکتے ہیں۔

سلسلۂ شعر العجم

حصہ اول فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا عہد بعہد کی ترقیوں اور انکے خصوصیات واسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے اور اسی کے ساتھ تمام شعراء (عباس مروزی سے نظامی تک) کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ ہے۔ قیمت ...۲۰

حصہ دوم شعرائے متوسطین کا تذکرہ (خواجہ فرید الدین عطار سے حافظ و ابن یمین تک) مع تنقید کلام اس میں حافظ شیرازی کی شاعری میں سلوک پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ قیمت ...۳۵

حصہ سوم شعرائے متاخرین کا تذکرہ (فغانی سے ابو طالب کلیم تک) مع تنقید کلام قیمت ...۳۲

حصہ چہارم اس میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ایران کی آب و ہوا اور تمدن اور دیگر اسباب نے شاعری پر کیا اثر کیا، کیا تغیرات پیدا کیے اور شاعری کے تمام انواع و اقسام میں سے مثنوی پر بسیط تبصرہ قیمت ...۲۵

حصہ پنجم اس میں قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ ہے۔ قیمت ...۲۵

مولفہ علامہ شبلی نعمانی

"منیجر"

تحریک عصبۂ اندلسیہ کا ارتقاء

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

شام ولبنان سے جن لوگوں نے تلاش معاش میں شمالی وجنوبی امریکا ہجرت کی ان کی تعداد ۱۳۹۵۰۰ بتائی جاتی ہے ان میں بہت سے اصحاب علم وادب بھی تھے۔[1] ہجرت کا سلسلہ انیسویں صدی کے اواخر سے شروع ہوکر بیسویں صدی کے ربع اول تک جاری رہا جس طرح شمالی امریکا میں خلیل جبران نے تحریک رابطۂ قلمیہ شروع کی جنوبی امریکہ میں میشال المعلوف اور شکر اللہ جر نے اسی انداز پر ایک ادبی تحریک کا آغاز کیا مگر یہ واضح رہے کہ جب رابطۂ قلمیہ ختم ہوگئی اور اس کے ارکان منتشر ہوگئے اسوقت جنوبی امریکہ سے عصبۂ اندلسیہ کا ظہور ہوا۔ ان دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ رابطۂ قلمیہ کے ادیب باغی تھے انھوں نے قدیم عربی ادب کی بنیادی خصوصیات واسالیب سے بغاوت کی۔ عربی قواعد کی خلاف ورزی کی۔ ایسے صیغے استعمال کیے جن کی اجازت صرف ونحو کے عربی ماہروں نے نہیں دی ہے انھوں نے ایسی جمعیں بنائیں جو عرب استعمال نہیں کرتے، عربی قواعد واسالیب سے اس انحراف ومخالفت کے باعث ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے مہجری ادب پر تنقید کی ہے۔ مگر اس کے برعکس تحریک عصبۂ اندلسیہ میں جو ادیب وشاعر شریک ہوئے انھوں نے یہ طے کرلیا کہ وہ عربی قواعد روایات

۱؎ العروبۃ فی شعر المہجر الامریکی الجنوبی از عبدالرحیم محمود زلط ص ۱۱ طبع اول ۱۹۷۲ء

اور اسالیب کی پوری پابندی کریں گے اور ان کی حفاظت کو اپنا فرض اولین تصور کریں گے۔ اس طرح وہ باغیانہ لہجہ اور قدیم عربی ادب کے خلاف جہاد کی جو سرگرمی تحریک رابطۂ قلمیہ میں نظر آتی ہے اس کے ردعمل کے طور پر اس تحریک نے عربیت خالصہ کی حمایت میں قدم اٹھایا اور اس کی حفاظت پر زور دیا۔

جنوبی امریکہ میں جو عرب رسالہ نکالتے تھے وہ درحقیقت ادب کے ذریعہ سے روزی کمانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ ان کا ذوق وشوق نہ تھا۔ اسی بنا پر ان کے ذریعہ جو ادب وجود میں آرہا تھا وہ دوسرے درجہ کا تھا۔ اس میں معیار کی واضح کمی تھی۔ اس کیفیت کو میشال معلوف نے محسوس کیا۔ وہ صحیح معنی میں ایک ادیب تھے ان کو یہ بات نہایت ناگوار تھی کہ ادب کے ذریعہ روپیہ کمانے کے لیے اس کو غیر معیاری انداز میں پیش کیا جائے۔ چونکہ وہ خود مالدار تھے اور خدا نے ان کو بہت کچھ وسعت دے رکھی تھی لہذا انھوں نے ادب کی سرپرستی کی اور دل کھول کر اس پر اپنی دولت لٹائی۔ حسن اتفاق سے ان کا خاندان ادیبوں کا تھا ان کے بھائی قیصر معلوف اور ان کے تین خالو فوزی معلوف، شفیق معلوف اور ریاض معلوف سب اس تحریک کے ساتھ ہوگئے اس طرح دوسرے ادبا بھی اس میں شریک ہوئے۔ اس سلسلہ میں شکر اللہ الجر کا ذکر خاص طور سے ضروری ہے۔ جو صاحب فکر ونظر ادیب وشاعر اور مجلہ اندلس جدیدہ کے مدیر تھے وہ جنوبی امریکہ میں ایک ادبی تحریک کے آغاز کے لیے سان پاولو آئے اور جب انھوں نے میشال معلوف سے اس کے متعلق گفتگو کی تو وہ نہایت مسرور ہوئے کیونکہ خود ان کے خیالات بھی یہی تھے۔ لہذا ان دونوں نے مل کر اس عظیم ادبی خدمت کا عزم بالجزم کیا۔[1]

۱؎ تاریخ الشعر العربی الحدیث از احمد قبش، لبنان بیروت ص ۳۱۲۔

تاسیس عصبۂ اندلسیہ کی تاسیس ۵ جنوری ۱۹۳۲ء کو ساں اوبو برازیل میں ہوئی۔ میشال معلوف اس کے صدر مقرر ہوئے۔ داؤد شکور نائب صدر بنے۔ نظیر زیتون سکریٹری قرار پائے۔ یوسف بعینی دوسرے سکریٹری بنے۔ جورج حسون نشر و اشاعت کے آفیسر بنے اور مندرجۂ ذیل لوگ اس تحریک کے ممبر بنائے گئے۔ نصر سمعان، حسن عزاب، یوسف غانم، حبیب مسعود، اسکندر کرباج، انطون سلیم سعد اور شکر اللہ الجر۔ اس تحریک کا نام "العصبۃ الاندلسیۃ" رکھا گیا یعنی جماعتِ اندلس یا اندلسی جماعت۔ اس نام کی مناسبت سے ایک رسالہ "العصبۃ" کے نام سے جاری کیا گیا اور تحریک کے لیے ایک شاندار عمارت میں دو کمرے اور ہال لے کر اس کے لیے مخصوص کر دیے گئے۔ ہال اور دونوں کمرے نہایت وسیع اور عمدہ قسم کے سامان سے مزین تھے جو کچھ بھی تحریک پر خرچ ہوتا تھا اس کی پوری ذمہ داری میشال معلوف پر تھی انھوں نے اس کے لیے دل کھول کر اپنا مال خرچ کیا اور اس کو کامیاب بنایا۔ سنہ ۱۹۳۶ء تک ان کا یہی طریقہ رہا اس کے بعد وہ لبنان واپس آگئے شاید انکو اسکا احساس ہو گیا ہو کہ ان کی موت قریب ہے۔ چنانچہ لبنان واپس آکر اپنے وطن "زحلۃ" میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔[1]

مقاصد اس تحریک کا نام عصبۂ اندلسیہ اس بنا پر رکھا گیا کہ عربوں نے علم و ادب کی آبیاری اندلس میں کی تھی اور وہ ان کی تہذیب و تمدن کا نہایت اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ہے۔ اسی مناسبت سے تبرکاً یہ نام رکھا گیا۔ میشال معلوف کے بعد اس تحریک کے دوسرے صدر الشاعر القروی ہوئے پھر ان کے بعد شفیق معلوف صدر منتخب کیے گئے جنھوں نے تحریک کے مقاصد کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے :۔

[1] نفس المصدر ۳۱۲-۳۱۳۔

"برازیل میں عربی زبان کے ادبا جمع ہوئے جن کا مقصد عربی ادب کو مہجر (ارض ہجرت) میں محکم بنانا ہے۔ اس کی غایت خالص ادبی مجلس کی تاسیس ہے اس مجلس سے ایک رسالہ "عصبۃ" کے نام سے نکالا جائے گا جو اس تحریک کا ترجمان ہوگا۔ تمام وسائل ادب کو استعمال کر کے عربی ثقافت کے معیار کو بلند کرنا اس تحریک کا مقصد ہے تاکہ تعصب کے خلاف جد و جہد کی جا سکے۔ عقائد کو جانچا جائے، اس تقلید پر تنقید کی جائے جو روح عصر کی مخالف ہے اور فکری جمود پیدا کراتی ہے۔ مگر اس خالص ادبی مجلس کا کوئی سیاسی، مذہبی یا تعلیمی مطمحِ نظر نہیں ہے"۔[1]

جب رسالہ "العصبۃ" نکلا تو اس تحریک کے مقاصد کی تشریح اس میں اس انداز سے کی گئی :۔

"اگر تحریک عصبہ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے ادب میں کوئی معین راہ اختیار نہیں کی تو ٹھیک ہے اس لیے کہ اس کے تمام ارکان نے اس امر سے اتفاق کر لیا ہے کہ وہ ادب کی راہ میں جد و جہد کریں گے اس کو فن و جمال تصور کر کے کسی معین نظریہ کو اپنے اوپر مسلط نہ کریں گے۔ اسی بنا پر وہ کسی ایک متعین ادبی چشمہ سے استفادہ کے قائل نہیں اور نہ تجدید کے لیے کسی خاص ادبی رنگ میں رنگ جانا پسند کرتے ہیں۔ بلکہ تحریک عصبہ اور اس کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے لیے یہ امتیاز پسند کیا ہے کہ وہ فصیح و معروف عربی اسالیب کو اختیار کریں گے اور حتی الوسع عربی ادب کی پابندی اپنے اوپر

[1] الشعر العربی المعاصر از ڈاکٹر طاہر احمد مکی طبع ثالث دار المعارف قاہرہ سنہ ۱۹۸۶ء ص ۱۳۴۔

لازم جانیں گے۔ اسی طرح تجدید کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی وہ تجدیدی کوششوں کے اضطراب اور عربی روایتوں سے خروج و بغاوت سے اپنا دامن بچاکر جم کر ادب کی خدمت کریں گے[1]

اس تحریک نے مہاجر ادبا کو دوبارہ جمع کرکے ان کو اپنی ادبی و شعری صلاحیتوں کے اظہار کا موقع عطا کیا۔ وہ اپنے دفتر میں جمع ہو کر اپنی مجالس منعقد کرتے تھے اور تحریک کا مجلہ ان کے افکار کو شایع کرتا تھا۔ برازیل میں یہ عربی ادب کی پہلی منظم آواز تھی جس کے اثرات عربی ادب پر مرتب ہوئے۔

رسائل | جو رسالہ "العصبۃ" کے نام سے اس تحریک نے ساںاؤلو برازیل سے شایع کیا وہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۱ء تک پابندی سے نکلتا رہا۔ وہ کل ۱۳ برس نکلا۔ کسی رسالہ کا اتنی مدت تک پابندی سے شایع ہونا خود اس کی زندگی کا ضامن ہے۔ وہ بند اسی بنا پر ہو گیا کہ برازیل کے صدر نے یہ پابندی عائد کر دی تھی کہ پرتگالی کے سوا جو برازیل کی قومی زبان ہے۔ کسی دوسری زبان میں کوئی رسالہ شایع نہیں ہو سکتا مگر عربی زبان والوں نے جد و جہد کرکے دوبارہ رسالہ نکالنے کی اجازت حاصل کر لی۔ چنانچہ العصبۃ ۱۹۴۷ء میں دوبارہ شایع ہوا۔ اس میں شفیق معلوف کی مساعی کو دخل تھا۔

العصبۃ الاندلسیہ کی تاسیس سے قبل ایک مجلہ "الجالیۃ" کے نام سے سامی یواکیم راسی نکال رہے تھے موسیٰ کریم نے مجلہ الشرق نکالا۔ پھر شکر اللہ الجر نے "الاندلس الجدید" کے نام سے ایک مجلہ جاری کیا جس کو قبول عام حاصل ہوا[2] شکر اللہ الجر اور میشال معلوف

---

[1] الشعر العربی المعاصر ص ۱۳۴ اصل عبارت دیکھئے مجلہ العصبۃ الاندلسیۃ شمارہ ۷، ۱۹۵۳ء ص ۴۸
[2] العروبۃ فی شعر المہاجر الامریکی الجنوبی از عبدالرحیم محمود زلط دار الفکر العربی طبع اول ۱۹۷۳ء ص ۱۰۶۔

کی ملاقات نے تحریک العصبۃ الاندلسیۃ کو جنم دیا۔ جس کے لیے فضا پہلے تیار ہو چکی تھی۔

اس تحریک میں شعرا اور ادبا دونوں شریک ہوئے۔ شاعروں میں رشید سلیم خوری جن کا لقب الشاعر القروی ہے ان کے بھائی قیصر سلیم خوری ملقب بہ "الشاعر المدنی" شکر اللہ الجر جو تحریک کے اصل بانی ہیں مگر اس کو عمل میں لانے والے میشال معلوف ہیں، الیاس حبیب فرحات و نصر سمعان و ریاض معلوف، نعمت قازان، و جبران سعادت و شفیق معلوف، فوزی معلوف و میشال معلوف و عقل الجر و حسن غراب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

رسالہ العصبۃ الاندلسیۃ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۱ء تک نکلا دوبارہ ۱۹۴۷ء میں پھر نکلا ۱۳ برس کے عرصہ میں بے شمار نظمیں، تنقیدی مقالات، ترجمہ اور علمی تحفے اس میں شایع ہوئے۔ خاص طور سے برازیل کے ادب کے منتخب حصہ کا ترجمہ نثر اور نظم دونوں سے عربی میں کرکے اس کو "العصبۃ" کی زینت بنایا گیا۔ چونکہ برازیل کی زبان پرتگالی ہے اور اسپینی کا بھی وہاں رواج ہے اس بنا پر یہ ترجمے اہمیت کے حامل ہیں۔ اس مجلہ کے اڈیٹر حبیب مسعود تھے جب وہ دوبارہ نکلا تو پھر حبیب مسعود ہی نے اس کی ادارت کی۔ دوبارہ وہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک سرگرم عمل رہا۔ اندازہ اس مجلہ کا آخری دور تھا پھر ہمیشہ کے لیے وہ بند ہو گیا۔

اس تحریک کے فعال ارکان میں سے شفیق معلوف، رشید سلیم خوری "الشاعر القروی" اور عقل الجر فصیح عربیت کے قائل تھے اور عربی روایتوں اور اسالیب سے تجدد پسندی کے انحراف و بغاوت کو اچھی نظر نہیں دیکھتے تھے۔ مگر اس تحریک سے وابستہ مشہور بیشتر ادبا کا میلان تجدد کی جانب تھا۔ یعنی فوزی معلوف، شکر اللہ جر، الیاس فرحات،

قیصر سلیم خوری ملقب بہ "الشاعر المدنی" ریاض معلوف، ونظیر زیتون وحبیب مسعود۔ یہ سب اوزان میں حریت پسند، قافیہ میں تنوع اور انداز تعبیر میں ابتکار وابداع کے قائل تھے[1]

جس طرح شمالی امریکہ میں جبران خلیل، نسیب عریضہ اور ایلیا ابو ماضی کے بعد تحریک کمزور پڑگئی بالکل اسی طرح جنوبی امریکہ میں فوزی معلوف، شال معلوف اور عقل الجر کے بعد کوئی ان کی جگہ لینے والا نہ پیدا ہوا لہذا یہ تحریک کمزور پڑگئی۔ علاوہ ازیں بہت سے ادبار اپنے وطن لبنان واپس آگئے۔ اس طرح مہجری ادب کا تعلق ایک مخصوص دور سے ہے جو بہت قلیل عرصہ کو محیط ہے مگر معنوی طور پر اس کے اثرات دور رس ہوئے اور اس نے بلند ادب پیش کیا۔ اس ادب کی خوبی یہ بھی ہے کہ شمالی امریکہ والے انگریزی سے مستفیض ہو کر عربی ادب کی آبیاری کر رہے تھے مگر جنوبی امریکہ والے چونکہ برازیل میں مقیم تھے جہاں کی زبان پرتگالی تھی اور وہاں اسپینی زبان بھی رائج تھی اس لیے انھوں نے عربی میں پرتگالی اور اسپینی سے استفادہ کر کے اس کے ادب کو عظمت وبلندی عطا کی۔[2]

ڈاکٹر شوقی ضیف جنوبی امریکہ اور برازیل میں سرگرم عمل شعراء وادباء کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ان کے یہاں انقلابی سرگرمی اور بغاوت نہ تھی بلکہ وہ عربی کے عہد ماضی سے قریب تر تھے۔ فرق جو کچھ نظر آتا ہے وہ قدیم وجدید زمانہ اور انداز نظر کا ہے ورنہ دونوں ادب باہم ایک دوسرے سے بڑی مشابہت رکھتے ہیں۔ برازیل میں بیٹھ کر لکھنے والوں میں خاص کر فوزی معلوف اور شفیق معلوف نے جو سفرنامے لکھے ہیں ان میں

[1] الشعر العربی المعاصر ص ۳۵ [2] تاریخ الشعر العربی الحدیث از احمد قبش طبع اول ص ۳۱۳ سنہ ۱۹۷۱ء دار الجیل بیروت لبنان۔

عربیت اور عربی روح پوری طرح نمایاں ہے اور ان کے قصوں میں بھی مشرقی روح پوری طرح موجود ہے۔ فوزی معلوف نے جو سفرنامہ "علی بساط الریح" ہوا کے دوش پر اور شفیق معلوف نے جو سفرنامہ "عبقر" کے نام سے لکھا ہے وہ ابن شہید اندلسی کے سفرنامہ التوابع والزوابع اور رسالہ الغفران معری کے روحانی سفر کو یاد دلاتے ہیں۔ بلکہ خود اسی دور میں عرب میں جمیل زہاوی نے ثورۃ فی الجحیم (جہنم میں انقلاب) لکھا اور عقاد نے شیطان کی سوانحعمری لکھی۔ فوزی آسمان پر اڑتا ہے اور شفیق اپنے سفر میں ایک وادی جس کا نام عبقر ہے جہاں جنات رہتے ہیں وہاں سے گذرتا ہے[1] حبیب مسعود ایڈیٹر رسالہ "العصبۃ" نے صحیح لکھا ہے کہ:۔

"اس اصلاحی تحریک کا یہ مقصد نہ تھا کہ عربی ادب کے قدیم خزانوں سے بے تعلقی اختیار کی جائے یا ہر قدیم کو واجب الترک تصور کیا جائے۔ اس تحریک کا بنیادی طور پر یہ مقصد تھا کہ عربی گرامر، قواعد، الفاظ اور زبان میں آسانی پیدا کی جائے نئے الفاظ کو عربی میں داخل کیا جائے۔ عربی زبان کو اس لائق بنایا جائے کہ ادیب اپنی زندگی میں نئے زمانہ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک فکری ماحول کو کامیابی کے ساتھ جنم دے سکے"

ڈاکٹر محمد مندور شعراء مہجر کی مدافعت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"شعرائے مہجر کے یہاں زبان کی کمزوری نظر آتی ہے کبھی اتفاقاً نحوی وصرفی غلطیاں بھی مل جاتی ہیں مگر اس کی مثالوں سے بڑے بڑے ادبار بھی مبرا نہیں۔ رہا ان کا مالوف لفظوں کا استعمال تو یہ امر باعث حسن ودلکشی ہے۔ جو جذبات کے

[1] دراسات فی الشعر العربی المعاصر طبع سابع دار المعارف مصر ص ۲۵۵۔

ابھارنے کا عمدہ ذریعہ ہے اس لیے یہ الزام بے بنیاد ہے"[۱۵]

مندرجہ ذیل دواوین اسی تحریک کے ارکان کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں۔

دیوان		شاعر
دیوان القروی		الشاعر القروی
اعلام الوائی	ہوشیاری کے خواب	الیاس فرحات
زنابق الفجر والدو اند	فجر کے لالے۔ تجھے	شکر اللہ الجر
لکل زهرة عبیر	ہر پھول کی خوشبو ہے	شفیق معلوف
نداء المجادیف	تھکے ہاروں کی آواز	

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جب عصبۂ اندلسیہ کا غلغلہ بلند ہوا تو اس میں تحریک رابطہ قلمیہ کے ختم ہوجانے کی وجہ سے اس سے تعلق رکھنے والے باقی ماندہ وہ تمام ادباء جو شمالی امریکہ میں تھے عصبۂ اندلسیہ میں شامل ہو گئے اس طرح یہ تحریک پوری قوت سے ابھری اور ادیبوں کے اتصال کا ذریعہ بن گئی۔ اس طرح اس نئی تحریک کی آواز پورے عربی ادب میں عام ہو گئی[۱۲]

اوپر گذر چکا ہے کہ ان ادیبوں کی جد وجہد ادب، فن اور جمال تک محدود تھی اور زبان کی بے راہ روی اور تجدد پسندی کی کوئی گنجایش ان کے ادب میں نہیں تھی۔ یہ ادباء و شعراء جدید انداز فکر کے حامل اور روح عصر کے ترجمان ہونے کے باوجود قدیم کے خلاف شور و غوغا نہیں مچاتے تھے[۱۳]۔ انھوں نے خلیل جبران کی روش چھوڑ کر

۱۵؎ التیارات الادبیة فی لبنان از صلاح لبکی ۱۹۵۴ء ص ۱۴۹ ۔ ۱۴؎ بحوالہ مصنف کی کتاب "عربی شاعری کے جدید رجحانات" مطبوعہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ ۱۹۷۹ء ۔ ۱۲؎ النزعة فی شعر المہاجر الامریکی الجنوبی ص ۱۰۶، ۱۰۷ ۔ ۱۳؎ الناطقون بالضاد فی امریکا الجنوبیة از البدوی الملثم ص ۲۷۲۔

زبان میں فصاحت، متانت اور عربیت کو مدنظر رکھا ہے ایلیا ابو ماضی کلاسیکل عربی پر طنز کرتے ہوئے فخراً کہتا ہے:۔

لیستَ مِنّی اِن حَسِبتَ الشعر الفاظاً و وزنا

اگر تم وزن و الفاظ کو سب کچھ تصور کرتے ہو تو تم مجھ سے الگ ہو۔

خالفت دربک دربی وانقضی ما کان بیننا

تمہارے راستہ نے میرے راستہ کی مخالفت کی اور میرا تعلق تم سے کٹ گیا۔

اس کے رد عمل کے طور پر الیاس فرحات نے لکھا کہ:۔

اصحابنا المتحر دون خیالہم تقضی قریش بہ وتحیا حمیر

ہمارے اجداد حد سے تجاوز کر گئے ان کے خیال کو تسلیم کرنے کے بعد خاندان قریش کی سیادت ختم ہو جائے گی اور قبیلہ حمیر کی زبان زندہ ہو جائے گی۔

لغة مشوهة و معنی حائر خلف المجاز و منطق متعثر

بگڑی ہوئی زبان مفہوم مشوش مجاز کی مخالفت اور زبان میں کجی ہے۔

ویزعمهم فی زعمه متفننن عجباً کان الفن فیما یضمر

ان کا رہنما اپنے کو صاحب تفنن خیال کرتا ہے۔ تعجب ہے کہ وہ کس قسم کے فن کا حامل ہے

(اس میں خلیل جبران پر شاعر نے طنز کیا ہے)

لا الارض تفهم ما یصور لا لها ذاک الزعیم و لا السماء تفسیر

نہ زمین سمجھتی ہے جو وہ پیش کرتا ہے اور نہ آسمان اس کی تشریح کر سکتا ہے۔

شفیق معلوف تحریک عصبۂ اندلسیہ کی زبان پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

لنا اللغة المثلی متی انها سوی ها بصرح دعمنا کالصرح ممرد

نمونہ کی زبان ہماری ہے جب کہ اس کے قلعہ کی دیواریں گر جاتی ہیں تو ہم اسے
ایک نئے محکم قلعہ سے مستحکم کر دیتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ہم عربی زبان کے قلعہ کو برابر
مستحکم کرتے رہتے ہیں۔

عبدالرحیم محمود زلط اپنی کتاب العروبۃ فی شعر المہاجر الامریکی الجنوبی
میں لکھتے ہیں کہ جنوبی امریکہ کے ادیبوں کی زبان میں قوت و صفائی ہے۔ معانی میں گہرائی
ہے۔ انکی شاعری میں عربی ذوق رچا بسا ہوا ہے اور وہ مقامی زبان و ادب کے اثر
سے خالی ہے۔ ان کے یہاں ابہام و تعقید نام کو نہیں جبکہ شمالی امریکہ میں ابہام و
غموض، انگریزی انداز تعبیر، انگریزی الفاظ اور غیر ملکی لفظوں کی تعریب عام اور
قابل فخر سمجھی جاتی ہے۔

شوقی ضیف رقمطراز ہیں کہ "اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ جن لوگوں کو بشار بن
برد، مسلم، ابوتمام، بحتری اور متنبی وغیرہ کے اشعار پڑھنے اور ان سے لطف
اٹھانے کی عادت ہے وہ شمالی امریکہ کے مہاجرین کی شاعری سے لطف اندوز
نہیں ہو سکتے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کا قالب اور مواد دونوں عربی ذوق کیلئے
اجنبی اور نامانوس ہے اور اگر لفظ، شکل اور خارجی ہئیت سے قطع نظر بھی کرلیا جائے
تو وہ ادب موضوعات کے لحاظ سے قدیم عربی شاعری کے دائرے سے باہر ہے[1]

الیاس فرحات کے دیوان "الربیع" پر جو مقدمہ استاذ جوارج حسون معلوف
نے لکھا ہے اس میں وہ رقمطراز ہیں:۔

"ادبا مہاجرین دو قسم کے ہیں ایک قسم وہ ہے جو سکسن امریکہ میں رہتی ہے وہ ایسے

[1] دراسات فی الشعر العربی المعاصر ص ۲۵۱۔

بحر ذخار میں ہیں جس کے سیلاب نے ان کو اہل عرب سے دور پھینک دیا ہے۔
انھوں نے عربوں کے اسالیب و قواعد کا لحاظ اپنے افکار و جذبات کی تعبیر میں ادبی
انداز سے نہیں کیا۔ صرف کچھ ہی لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ لوگ انگریزی ادب
کی طرف مائل ہو گئے۔ انھوں نے اجنبی استعارے اور تشبیہات کا استعمال کیا اور
الفاظ کے اشتقاق میں حسب مرضی کام لیا۔ اپنے خیال کی ایسی فضا پیش کی جو وہم و
ابہام سے عبارت تھی۔ یہاں تک کہ اہل عرب کے لیے ان کا کلام ناگوار ہو گیا۔
دوسروں کو چھوڑ یئے۔ دوسرے قسم مہاجرین کی لاطینی امریکہ میں جاکر بسی۔ خاص
طور سے برازیل میں، ان لوگوں نے عربی ادب کی روایتوں کی محافظت کی انھوں نے
اس کو استحکام بخشا اپنے رشتہ کو عربیت سے کمزور نہیں ہونے دیا بلکہ اسے اور زیادہ
محکم و مضبوط کیا[1]

ان کی وسعت نظر کا یہ حال تھا کہ عیسائی ہوتے ہوئے بھی شاعر قروی کہتا ہے
کہ اپنے مدارس اور یونیورسٹیوں میں قرآن، حدیث اور نہج البلاغہ پڑھاؤ تاکہ تم کو
فصیح اسالیب سے واقفیت ہو اور تمہارے اندر زبان و بیان کا ملکہ پیدا ہو[2]۔ مناسب
معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں اس تحریک کے چند بنیادی معماروں کا تذکرہ کر دیا جائے۔

شکر اللہ الجر

یہ ۱۹۱۹ء میں برازیل پہونچے کچھ دنوں تک تجارت کرنے کے بعد
"الاندلس الجدیدۃ" کے نام سے ایک مجلہ جاری کیا۔ دراصل ایک ادبی انجمن کی تشکیل کا
فیصلہ انھی کا تھا جس کے لیے اپنے شہر سے سفر کر کے وہ میشال معلوف کے پاس

[1] دراسات فی الشعر العربی المعاصر از شوقی ضیف ص ۲۵۱ [2] العروبۃ از عبدالرحیم
محمود زلط ص ۲۲۔

"سان اولو گئے"۔ انھوں نے اپنا دیوان ۱۹۳۴ء کے اواخر میں شایع کیا اس میں بہا نظمیں شامل ہیں جو وطنی و اصلاحی موضوعات سے متعلق ہیں۔ اس میں لبنان میں غیر ملکیوں کی دخل اندازی کا ذکر بھی ہے۔ شکر اللہ الجر کا دوسرا دیوان زنابق الفجر (صبح کے پھول (للی)) ہے جو حسن و دلکشی سے معمور اور شاعر کی فنی عظمت کا ثبوت ہے

جورج صیدح شکر اللہ الجر کی نثر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:۔

"گو وہ ایک بلند پایہ شاعر ہیں، ان کا فن جمیل ہے وہ اچھی تصویر کشی کرتے ہیں عمدہ نغمے مرتب انداز سے پیش کرکے اپنے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں مگر میں انکی شاعری سے زیادہ ان کی نثر سے متاثر ہوں"[1]

ایک نمونہ ان کے کلام کا ملاحظہ ہو:۔

ھا اذان الشیخ فی القبة یدوی فی الفضاء   والدعاء للہ فی الجامع والدیر سواء

دیکھو قبہ سے نکل کر شیخ صاحب کی اذان فضا میں گونج رہی ہے اور خدا سے دعا مسجد اور کنیسہ میں یکساں ہے۔

فصلاة الطیر فی الربوة والسفح غناء   وعبیر الزھر بخور تعالی فی الھواء

پرندوں کی نماز ٹیلوں اور دامن کوہ میں نغمہ آفرینی ہے اور پھول کی خوشبو بھاپ بنکر فضا میں بلند و عطر بیز ہوجاتی ہے

لا یضیر اللہ ان نعبدہ حیث یشاء   ھیکل اللہ جبال و بحار و سماء

اس میں کوئی خدا کا نقصان نہیں کہ ہم اسکی عبادت وہاں کریں جہاں وہ چاہتا ہے خدا کی نشانیاں پہاڑ سمندر اور آسمان ہیں

الشاعر القروی | رشید سلیم خوری ملقب بہ شاعر قروی نے تحریک عصبہ اندلسیہ کو چار چاند لگا دیے۔ قروی کے والد نے قرض چھوڑا تھا اور چھوٹے بھائیوں کی ذمہ داری بھی انہی پر تھی مگر ان کے چچا نے برازیل سے سفر خرچ بھیج کر ان کو برازیل بلالیا ۱۹۱۳ء میں

[1] ادبنا وادباؤنا فی المہاجر الامریکیہ از جورج صیدح ص ۳۹۱۔

سمندر کے راستے سے یہ برازیل پہونچے۔ جب کشتی میں سوار ہوئے اور سمندر کے مناظر دیکھے تو ان کی شعری صلاحیتیں ابھر آئیں اور سمندر میں قصائد پر قصائد نظم کرتے رہے۔ برازیل پہونچ کر بھی آرام کی زندگی ان کو نصیب نہ ہوسکی۔ پہلے ٹائی بناکر بیچا اور کندھے پر خوانچہ ڈھوکر سامان فروخت کیا پھر مدرس ہوگئے مگر اس حال میں بھی مگن رہے اور شاعری کرتے رہے ان کی پوری زندگی شاعری میں گزری۔ وہ ایک اچھے صاحب فن تھے جنھوں نے اپنے دور کے اہم واقعات اور رجحانات کی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ اپنی پردیسی زندگی کے خط و خال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

نائ من الاوطان یفصلنی   عمن احب البر والبحر

وطن سے دور ہوں اور جن لوگوں سے میں محبت کرتا ہوں انکے درمیان اور میرے درمیان بحر و بر حائل ہیں۔

فی وحشة لا شیئ یونسھا   الا انا والوجد والشعر

ایسی وحشت ہے جس کو کوئی چیز دور نہیں کرسکتی۔ بس میں ہوں، محبت ہے اور شاعری ہے۔

حولی اعاجم یوطنون کما   للضاد عند لسانھم قدر

میرے چاروں طرف عجمی بستے ہیں۔ عربی زبان کی عظمت کے تصور سے وہ عاری ہیں

لو عاش بینھم ابن ساعدة   لقضی ولم یسمع له ذکر

اگر ان عجمیوں میں ابن ساعدة الایادی خطیب بھی ہوتا تو پوری زندگی گنوا دینے کے بعد وہ بے نام و نشان مرتا۔

ناس ولکن لا انیس بھم   ومدینة ولکنھا قفص

یہاں لوگ ضرور ہیں لیکن ان میں کوئی غم گسار نہیں۔ شہر ہے لیکن قفس کی طرح

اما انا والغم کدلبی   صخر یحس ولیتنی صخر

میں غم کی زنجیر میں بندھا ہوں۔ چٹان بھی احساس رکھتی ہے (گھستی ہے)، کاش میں چٹان ہوتا

ایک بار قروی ساحل سمندر پر برازیل میں ٹہل رہے تھے کہ اچانک ان کو لبنان کا سمندر یاد آگیا۔ وہ کہتے ہیں :۔

یانسیم البحر البلیل سلام   زارک الیوم صبک المستہام

اے سمندر کی بھیگی ہوا تجھ پر سلام ہو۔ آج تیری زیارت تیرے عاشق نے کی ہے۔

ان تکن ما عرفتنی فلک العذر   فقد غیر المحب السقام

اگر تونے مجھ کو نہیں پہچانا تو تیرے پاس عذر ہے اس لیے کہ بیماری نے عاشق کی شکل وصورت بدل ڈالی ہے

او لا تذکر الغلام رشیدا؟   انتی یانسیم ذاک الغلام

کیا تو چھوٹے بچے رشید کو نہیں جانتی۔ اے نسیم :۔ میں وہی لڑکا ہوں لبنان والا۔

طالما زرتنی اذا انتصف اللیل   بلبنان والأنام نیام

اکثر تونے مجھ سے لبنان میں آدھی رات کو ملاقات کی ہے جب کہ مخلوق خوابیدہ تھی۔

قروی کی زندگی کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ ان کے احباب چندہ سے ایک گھر خرید کر ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ تحریک عصبۂ اندلسیہ کے ارکان نے ۳۰ ہزار لبنانی لیرہ کے بقدر رقم جمع کرلی۔ مگر جب شاعر قروی کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے جورج صیدح کو لکھا کہ میں اپنی علمی وادبی خدمت کا صلہ اس فانی دنیا میں نہیں لینا چاہتا۔ میں ان شہدا سے بہتر نہیں ہوں جو وطن کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔ یہ سن کر ان کے احباب نے طے کیا کہ اس رقم سے ان کی کلیات شایع کردی جائے گو قروی کو یہ بات بھی پسند نہیں تھی مگر ان کے احباب نے ان کا کوئی عذر نہیں سنا اور دیوان القروی شایع کردیا یہ ضخیم دیوان ان کی نظموں کے سات مجموعے پر مشتمل ہے[1]۔

[1] العروبۃ فی شعر المہاجر الامریکی الجنوبی ص ۱۸۶۔ ۱۹۰۔ ۲۰۰۔

فوزی معلوف[1]

فوزی معلوف نے ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے اس تحریک کو آگے بڑھانے میں اور اس کے شعری سرمایہ کو بلندی عطا کرنے میں اہم حصہ لیا ہے۔ ان کو مدۃ العمر عربوں کے سیاسی واجتماعی مسائل سے دلچسپی رہی اور انھوں نے ان کے بارے میں نظمیں لکھیں۔ ان کی شاعری کے نگارخانہ میں ان کی پوری زندگی مصور دکھائی دیتی ہے۔ ان کی موت کے بعد تحریک عصبۂ اندلسیہ کے دوستوں نے ان کا ایک مجسمہ بنا کر ان کے وطن بھیجا جو "زحلہ" کے ایک پارک میں نصب کیا گیا اور ان کے بھائی شفیق معلوف نے ایک نظم سے اس کا استقبال کیا۔

علی بساط الریح (ہوا کے دوش پر) ان کی مختلف رزمیہ نظموں کا مجموعہ ہے مگر یہ ساری نظمیں مسلسل اور باہم مربوط ہیں، اس میں زمین پر خون ریزی، شر وفساد، انسان کی بے حرمتی اور عربوں پر استعماریوں کے مظالم سے پریشان ہو کر فوزی فضا میں اڑ جانا اور آسمان کی وسعتوں سے متمتع ہونا چاہتے ہیں اس رزمیہ میں ہم آہنگیت ہیں اور سب بحر خفیف میں ہیں البتہ قوافی بدل گئے ہیں۔ کل اشعار کی تعداد ۱۴۳۲ ہے۔

شاعر نے درحقیقت خود اپنی ایک مملکت آسمان پر بنائی ہے جب وہ اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کو زمین پر پوری نہیں کرسکا تو اس نے آسمان میں اپنے تخیل سے یہ ارمان پورا کیا۔ اس کی اس مملکت میں نہ ظلم وزیادتی ہے نہ فساد اور خون خرابہ ہے، نہ استعمار واستعباد ہے۔ ہر چیز آزاد ہے۔ مگر اس ہوائی سفر میں یا اور ہوائی

[1] معلوف جانوروں کے بھس کی جگہ کو کہتے ہیں یہ دراصل معیوف تھا یعنی غساسنہ جن سے خلفاء نے جزیہ نہیں لیا بلکہ جب عباسیوں نے ان سے جزیہ لیا تو اسوقت سے یہ معلوف کہلائے۔ العروبۃ ص ۱۲۱۔

حکومت میں بھی وہ عربوں کی مصیبت اور زمین پر خون و فساد کے تخیل سے غافل نظر نہیں آتا۔ وہ کہتا ہے :-

انا عبد القضاء تملأ نفسی | رهبة من بشيره ونذيره

میں قسمت کا بندہ ہوں میرا نفس اس کی عمدہ اور خوفناک خبروں سے ڈرتا ہے۔

انا فی قبضة العبودية العمياء | اعمى مسير بغير بصيرة

میں اندھی عبودیت کے قبضہ میں ہوں۔ ایسا اندھا ہوں جو دھوکہ میں چلتا ہے۔

نحن لم نهجر البسيطة الا | هربا منه واجتنابا من شره

ہم نے دنیا کو صرف اس کے شر سے بچنے کے لیے چھوڑا ہے اور فرار اختیار کیا ہے۔

وہ فضا میں چڑیوں کو مخاطب کر کے یہی بات کہتا ہے :-

زارك اليوم متعباً ينشد الراحة | فی هدأة السكون و سحره

تکان کی حالت میں یہ ایک تھکا ماندہ آج تیری زیارت کو آیا ہے وہ فضا کے سکون و سحر کا طلب گار ہے۔

فر من ارضه فرارك عنها | من اذى اهله وتنكيل دهره

وہ اپنی زمین سے اسی طرح بھاگا ہے جس طرح تو اپنے گھر والوں اور اپنے زمانہ کے عذاب و اذیت سے بھاگی ہے۔

شاعر آگے پرواز کر کے ستاروں تک پہونچتا ہے اور ان کو مخاطب کر کے اپنے کو یوں متعارف کراتا ہے :-

هو من خلق عالم الأرض | يفطى الشقاء كل بطاحه

(شاعر ستاروں سے اپنے بارے میں کہتا ہے کہ) وہ اس عالم ارض کی مخلوق ہے جہاں کی ساری وادیوں پر ظلم و بدبختی چھائی ہوئی ہے۔

ان اشعار میں معلوف نے اپنے وطن کے مصائب کی عکاسی کی ہے۔[1]

---

[1] العروبة ص ۱۲۲ تا ۱۲۷۔

فوزی یہ تصور کرتا ہے کہ ہوائی جہاز کو جن چلا رہے ہیں لیکن بعد میں اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ یہ تو استعماری طاقت کا کل پرزہ ہے اس بنا پر وہ فنی لحاظ سے زیادہ کامیاب نظر آتا ہے۔ شفیق معلوف نے اپنے سفر عبقر میں جنوں کی وادی کا منظر دکھایا ہے جو ہمارے قدیم قصہ نگاروں کی پیروی ہے۔[1]

شفیق معلوف | زحلہ میں پیدا ہوئے، یہ اپنے بھائی فوزی سے ۷ برس چھوٹے تھے۔ کلیۂ شرقیہ میں تعلیم مکمل کر کے جریدہ "الف باء" دمشق میں ملازم ہو گئے اور ۳ برس کام کیا، جس کی وجہ سے وہ ادبی حلقوں میں معروف ہو گئے۔ پھر اپنے والد کے پاس واپس آکر علم و ادب کی تحقیق میں لگ گئے۔ دوران ملازمت انھوں نے ایک دیوان "الاحلام" (خواب) کے نام سے شائع کیا۔ شفیق نے شادی کرنے کے فوراً ہی بعد برازیل کو ہجرت کی۔ وہاں اپنے خالو کے ریشم کے کارخانہ میں ملازم ہو گئے اور مالی حیثیت سے خوشحالی کی زندگی بسر کی۔ انھوں نے دوسرے مہاجرین کی طرح مصیبتیں نہیں اٹھائیں بلکہ زندگی کا لطف "ساں اولو" میں پایا۔[2] شفیق جیسے ہی پانی کے جہاز پر سوار ہو گئے لبنان کی محبت میں ایک عمدہ قصیدہ لکھا جس میں اپنے بچپن اور جوانی کا ذکر اور احباب کی صحبتوں کی یادیں بیان کی ہیں۔[3]

عبقر ان کی خیالی طویل رزمیہ نظم ہے جو شاعرانہ بلندی کا روشن منارہ اور فن کا شاہکار ہے۔ یہ افسانی رزمیہ ہوتے ہوئے بھی انسانی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کی

---

[1] دراسات فی الشعر العربی المعاصر طبع ہفتم دار المعارف ص ۲۵۵ [2] ادباء دار نافی المهاجر الامریکیة از جورج صیدح ص ۲۵۶ [3] الناطقون بالضاد فی الامریکا الجنوبیة از البدوی الملثم ص ۲۹۱۔

ترجمان ہے اس میں انسانی زندگی کے اندر جو کش مکش حرص وطمع، شہوانی جذبات نفاق باہمی جنگ وجدال اور نفرت پائی جاتی ہے اس کی عمدہ تصویر کشی نہیں کی گئی ہے بلکہ یہ ان گھناونی باتوں کے خلاف اظہار بغاوت ہے جس کے آخر میں اخوت وصداقت کی دعوت ہے۔ قدیم اساطیر میں عبقر کو ایک گاؤں بتایا گیا ہے جہاں جن رہتے تھے۔ شفیق منے اسی جنوں کے گاؤں سے اپنے مطلب کے اشخاصِ قصہ تلاش کیے ہیں اور جاہلانہ خیالات اور خرافات سے مواد اخذ کرکے اپنے رزمیہ کو کامیاب بنایا ہے۔ پورے رزمیہ میں در حقیقت وطن عربی پر استعماری طاقتوں کے ظلم وجبر کی تصویر کشی کی گئی ہے۔[1]

عباس محمود عقاد رزمیہ عبقر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "یہ ہجرت عالم انسانیت سے وادیٔ جن کی طرف ہے۔ جس میں واقعات سے کہیں بڑھ کر خیالات کی دنیا پائی جاتی ہے۔ اس وادی میں جانے والا بحر و بر بھول کر "زحلہ" لبنان پہونچ جاتا ہے یا پھر سان پاولو برازیل۔[2]

استاذ شوقی ضیف رقمطراز ہیں کہ معلوف کے بیٹوں نے اپنے اشعار میں اپنے اسلاف کی وراثت بیان کی ہے قدما سے تاریخی تعلق کا ذکر کیا ہے موجودہ حالت کی تصویر کشی کی ہے۔ ماضی ہمیشہ ان کے ساتھ رہا۔ یہ کیفیت خیال میں اور قصہ میں فوزی معلوف کے "سفر" ہوا کے دوش پر" علی بساط الریح اور شفیق معلوف کے سفرنامہ (رزمیہ) العبقر میں بالکل واضح ہے۔[3]

---

[1] العروبۃ فی شعر المهاجر الامریکیۃ ص ۱۳، [2] دراسات فی المذاہب الادبیۃ والاجتماعیۃ از عقاد ص ۵، [3] دراسات فی الادب العربی المعاصر از شوقی ضیف طبع ہفتم ص ۲۵۵۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ مہجری ادب کا اصل امتیاز وطن کی محبت کا وہ جذبہ ہے جو مہجری شعرا کی شاعری کو بلند آہنگ نغمہ میں تبدیل کرکے اس کے اندر سوز و گداز پیدا کرتا ہے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس سلسلہ میں اپنی مشہور کتاب حدیث الاربعاء میں یہ عمدہ تبصرہ کیا ہے۔

جنوبی امریکہ میں زندگی آسان ہے مگر نشاط سے خالی نہیں ہر چند وہاں کام مل جاتا ہے مگر اتنی مادی فارغ البالی نہیں ہے کہ قلب و ذوق فاسد ہو جائیں۔ وہاں عرب مہاجرین نے امید اور وطن کی یادوں کے سہارے دن گذارے۔ انکے سامنے امیدوں کے شیش محل تھے۔ مگر لبنانی اور شامی مہاجرین نے ایک لمحہ کے لیے یہ فراموش نہیں کیا کہ ان کا اصل وطن لبنان یا شام ہے۔ انھوں نے لبنان میں اپنے والد، اپنی والدہ اور چھوٹے ہوئے بھائیوں کو یاد رکھا اس لیے وہ یہاں سے کچھ کما کر ان کو بھیجنے کی فکر میں رہے۔ وہ کمندوں کے ذریعہ خطوط اور ہواؤں کے ذریعہ یادوں کا پیام بھیجتے تھے اور جب صبح کو سورج ضوء فشانی کرتا تو وہ اسکو یاد کرتے جس طرح سورج کی روشنی برازیل میں ان کی یاد سے ان کے دل کو معمور کرتی تھی اور جب رات ہوتی تو ان کی یادیں اس کے خواب کی دنیا بساتیں اسی طرح وہ بھی اس غربت زدہ کی یاد سے اپنے خوابوں کی دنیا معمور پاتے۔ یہ سرگوشیاں خوابوں کے دھندلکوں میں ہوتیں۔ گویا خالص عربی زندگی میں زندگی کی ابتدائی بدویت لوٹ آئی ہو۔ لطف یہ ہے یہ سب واقعات جدید سوسائٹی میں ہوئے۔ جب ان عناصر کا تجزیہ کیا جائے گا تو محسوس ہوگا کہ زندگی ان مہاجرین کے یہاں اپنی ابتدائی اور اصولی شکل کی طرف لوٹ آئی تھی۔[1]

---

[1] حدیث الاربعاء ج ۳ ص ۱۸۰۔

ڈاکٹر شوقی ضیف اسی کیفیت کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ یہ جنوبی امریکہ کے مہاجرین شعراء اصل عربی روح کے ترجمان ہیں۔ عربوں کی زندگی شوق و یاد کے سوا اور کیا تھی؟ عصر جاہلی میں وہ اپنے گاؤں سے نکل کر سفر کرتے تھے جہاں گھاس اور پانی پایا وہاں قیام کیا سبزہ خشک ہوگیا دوسری جگہ سبزہ زار تلاش کرلیا۔ زمین میں مشرق و مغرب کے وہ سفر آشنا تھے۔ اسلام کی سربلندی کے دور میں شہر سے شہر اور ملک سے ملک کا وہ سفر کرتے تھے اور وہ اپنے پہلے اسفار اور نوجوانی کی یادوں کے سائے میں زندگی گذارتے تھے اور اپنے اجڑے ہوئے گھروں کو دیکھکر آنسو بہاتے تھے۔ یہ شوق و یاد ایک مستقل تصور و تصویر بن کر ان کے ساتھ ہوگئی جہاں بھی اور جس زمانہ میں بھی وہ رہے اور جن گذرگاہوں اور منازل سے وہ گذرے یادوں کے خزانوں سے دل کی دنیا کو معمور رکھا۔[1]

---

[1] دراسات فی الشعر العربی المعاصر ص ۱۲۳۔

دار المصنفین کی نئی کتاب

تذکرۃ المحدثین (حصہ سوم)

یہ دراصل ہندوستانی محدثین کی پہلی جلد ہے، اس میں امام صغانی، شیخ علی متقی، محمد بن طاہر، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، انکے فرزند شیخ نور الحق دہلوی اور ان دونوں کی اولاد و احفاد، شیخ الاسلام محمد اور مولانا سلام اللہ محدث رامپوری وغیرہ کے فضل و کمال اور علمی و دینی خدمات کا مرقع پیش کیا گیا ہے، اور حدیث میں انکے امتیازات اور کارنامے دکھائے گئے ہیں۔ شروع میں ایک مقدمہ بھی ہے اس میں علم حدیث کی اہمیت و ضرورت اور محدثین کی کاوش و دیدہ ریزی واضح کرنے کے بعد ہندوستان میں علم حدیث کی اجمالی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

قیمت ۵۵ روپیے

مرتبہ ضیاء الدین اصلاحی

امام ابوسعید اصطخری

از

حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

فقہائے شافعیہ میں امام ابوسعید اصطخری ممتاز بلند پایہ امام ابن سریج کے ہم پایہ ہیں، ان کا پورا نام و نسب یہ ہے۔

نام و نسب | حسن بن احمد بن یزید بن عیسیٰ بن الفضل بن بشار[1] بن عبد الحمید بن عبداللہ بن ہانی بن قبیصہ بن عمرو بن عامر، ابوسعید کنیت اور اصطخری، وطنی نسبت ہے جو اصطخر کی[2]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۷، ص ۲۶۸، ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں بشار کے بجائے یسار لکھا ہے۔ [2] اصطخر کی نسبت اصطخری اور اصطخرزی دونوں طرح مستعمل ہے، یہ شہر ایران کے جنوب مغرب میں واقع ہے ایک زمانہ میں اس کا شمار بڑے شہروں اور مضبوط ترین قلعوں میں ہوتا تھا، کہا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد ایران کے قدیم شہر پرسیپولیس کے کھنڈروں پر رکھی گئی تھی۔ اصطخر بن طہمورث بادشاہ فارس اس کا بانی تھا، طہمورث فارسیوں کے نزدیک بمنزلہ آدمؑ کے ہے، اصطخر فارسی بادشاہوں کا پایہ تخت بھی تھا، بعض روایتوں کے مطابق حضرت سلیمانؑ طبریہ سے یہاں صبح و شام آتے جاتے تھے، نیز یہاں ایک مسجد، مسجد سلیمانؑ کے نام سے موجود تھی، فارسی روایات کے مطابق جم بادشاہ جو ضحاک سے پہلے تھا وہ حضرت سلیمانؑ ہی تھے، اسلام سے پہلے اصطخر میں بادشاہوں کے خزانے رکھے جاتے تھے، یہاں کے باشندوں کو اپنے شاہی حسب و نسب پر فخر تھا، (بقیہ حاشیہ ص ۴۳۸ پر)

جانب ہے، یہ فارس کا ایک شہر ہے۔

سال پیدائش وہ ۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی حالات دستیاب نہیں، قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ علم کی تلاش میں سفر کرکے بغداد تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو رہے،

شیوخ و اساتذہ ان کے شیوخ و اساتذہ میں بغداد کے نامور علماء و فقہا کے اسمائے گرامی شامل ہیں، مثلاً سعدان بن نصر، حفص بن عمرو الربالی، احمد بن منصور رمادی، عیسیٰ بن جعفر الوراق، عباس بن محمد الدوری، احمد بن سعد الزہری، احمد بن حازم بن ابی غرزہ، محمد بن عبداللہ بن نوفل اور حنبل[1] بن اسحاق وغیرہ، ایک روایت کے مطابق انھوں نے امام ابوالقاسم انماطی سے بھی علوم کی تحصیل کی،[2]

تلامذہ ان سے سماعت و روایت کرنے والوں میں محمد بن المظفر، ابوحفص بن شاہین، یوسف

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۷) جود و سخاوت میں ان لوگوں کا مزاج بھی شاہانہ تھا، ساسانیوں کے دینی مرکز ہونے کا فخر بھی اسی شہر کو حاصل تھا، ۶۴۳ء میں یہ شہر، اسلام کے زیر نگیں ہوگیا اور ۶۸۴ء میں اسی کے قریب شیراز کا مشہور شہر آباد ہوا، دنیاوی خزانوں سے معمور ہونے کے ساتھ ہی یہ سرزمین بڑی مردم خیز رہی، نامور علماء و فضلاء اس کی خاک سے اٹھے، جن میں زیر تذکرہ امام اصطخری کے علاوہ ابوسعید عبدالکریم اصطخری اور ابوالعباس زاہد اصطخری وغیرہ بہت نمایاں ہیں، جریر بن الخطفی نے اس کی شان میں چند اشعار کہے تھے، جن میں کہا گیا تھا کہ فارس و روم و عرب، اسحاق بن ابراہیم کی اولاد میں سے ہیں، ان میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

وکان کتاب فیھم و نبوۃ　　وکانوا باصطخر الملوک و تیترا

دیکھئے معجم البلدان ج ۱ ص ۲۹۶ - ۲۷۵ اور المنجد ج ۲ ص ۵۰ اور ۱۲۵ [1] امام خطیب بغدادی نے بجائے حنبل کے جمیل بن اسحاق لکھا ہے [2] طبقات، ابن شہبہ ج ۱ ص ۷۶

بن عمر القدوس، ابوالحسن بن جندی اور ابوالقاسم بن الثلاج وغیرہ نمایاں ہیں، ان کے زیادہ مایہ ناز شاگرد امام ابوالحسن دارقطنی صاحب کتاب السنن و کتاب العلل ہیں جو اپنے زمانہ میں امیر المومنین فی الحدیث کے لقب سے مشرف تھے۔

فضل و کمال تذکرہ نگاروں نے ان کو عراق کا شیخ الشافعیہ لکھا ہے، ان کے عہد میں امام ابن سریج اور امام ابوعلی بن خیران دونوں کے علم و فضل کا سکہ بغداد میں قائم تھا، مگر ان دونوں کی موجودگی میں ان کو شیخ الشافعیہ قرار دیا جانا غیر معمولی علم اور فقہی کمال کا ثبوت ہے، امام اسنوی نے لکھا ہے کہ امام اصطخری اور امام ابن سریج دونوں بغداد میں شافعیوں کے شیخ تھے یہی قول ابن ہدایہ کا بھی ہے[1] امام نووی نے ان کو فقہاء شافعیہ میں عالی مقام لکھا ہے[2] امام سبکی نے الامام الجلیل کے ساتھ احد الرفعاء من اصحاب الوجوہ (فقہ شافعی کے ناموروں میں رفیع الشان) کے الفاظ کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے[3]

امام ابواسحاق شیرازی کا یہ قول تقریباً سب نے نقل کیا ہے کہ جب وہ بغداد آئے تو وہاں امام اصطخری اور امام ابن سریج کے بعد کوئی اور ایسا نہیں تھا کہ جس سے وہ اکتساب فیض کرتے اسی بنا پر امام خطیب بغدادی اور قاضی ابوالطیب طبری کا خیال ہے کہ امام ابوعلی بن خیران اپنی جلالت علمی کے باوجود امام اصطخری اور امام ابن سریج کے ہم رتبہ نہیں تھے[4] امام ابواسحٰق مروزی کی جلالت شان مسلم ہے لیکن امام اصطخری کی موجودگی میں ان کی اجازت کے بغیر وہ کوئی فتویٰ نہیں دیتے تھے،[5] اس کی وجہ امام شافعی کی کتابوں پر ان کی گہری نظر تھی[6]

[1] شذرات الذہب ج ۲ ص ۳۱۲ و طبقات ابن ہدایہ ص ۱۸ [2] تاریخ بغداد و طبقات کبریٰ بحوالہ ماسبق [3] طبقات کبریٰ ج ۲ ص ۱۹۳ [4] ایضاً [5] ایضاً [6] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۳۸۔

تقویٰ اور پرہیزگاری ان کے ورع و تقویٰ اور زہد و استغنا کا ذکر خاص طور سے کیا
گیا ہے، امام نووی نے صالح بن احمد الحافظ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ امام اصطخری فقیہ تو
تھے ہی اسی کے ساتھ ہی انہیں دیانت اور پرہیزگاری سے بھی بہرہ وافر ملا تھا[1] امام
خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ وہ بہت متقی، زاہد اور دنیا سے بے رغبت تھے[2] قاضی
ابوالطیب فرماتے ہیں کہ وہ ورع اور اتباع شریعت میں خاص مقام پر فائز تھے[3]
طبیعت میں بڑی احتیاط تھی[4] اور تقلیل پر گزر بسر کرتے تھے[5]

ان کا کرتا پاجامہ اور چادر ایک ہی طرح کی ہوا کرتی تھی[6]

عہدۂ قضا و احتساب خلیفہ مقتدر باللہ نے ان کو سجستان کا قاضی[7] مقرر کیا تھا، وہ شہر قم
میں بھی عہدۂ قضا پر فائز رہے، سجستان کے زمانۂ قضا میں انھوں نے دیکھا کہ وہاں کے
باشندے نکاح کے بارے میں ولی کا اعتبار نہیں کرتے ہیں، اس لیے انھوں نے اس میں
شدت سے کام لیا اور ولی کے بغیر ہونے والے نکاحوں کو باطل قرار دیا، وہ جب قم کے
قاضی تھے تو وہاں ایک شخص کا انتقال ہوا جس کے وارثین میں ایک بیٹی اور ایک چچا تھے،
جب میراث کا قضیہ شروع ہوا تو امام اصطخری نے نصف بیٹی کو اور نصف چچا کو دینے
کا حکم دیا، اس فیصلہ سے قم والے خوش نہیں ہوئے، ان کا کہنا تھا کہ بیٹی کو کل میراث
ملنی چاہیے، انھوں نے جواب دیا کہ شریعت کا فیصلہ یہی ہے، اس پر قم والے اس قدر
ناراض ہوئے کہ ان کے قتل کی سازش کر ڈالی، چنانچہ وہ وہاں سے بغداد واپس آگئے

[1] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۳۸ [2] طبقات کبریٰ [3] ایضاً [4] تہذیب الاسماء حوالہ بالا۔
[5] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۹۳ [6] طبقات کبریٰ [7] ایک روایت کے مطابق ان کو سجستان
کا والی بنایا گیا تھا، شذرات الذہب ج ۲ ص ۳۱۲۔

اور فرمایا کہ اہل قم رافضی اور غرابیہ ہے ان کے نزدیک اس طرح کی صورتوں میں مکمل میراث
کی حقدار بیٹی ہوتی ہے اور ان کے مسلک کی اصل یہ ہے کہ وہ حضرت فاطمہؓ ہی کو جناب رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی کل میراث کا حق دار سمجھتے تھے[1]

امام صاحب بغداد کے محتسب کے عہدہ پر بھی مامور ہوئے وہ پورے شہر کا دورہ
کرتے اور تمام حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے۔ دورہ کے دوران اگر نماز کا وقت
آجاتا تو اپنی سواری پر نماز بھی ادا کر لیا کرتے تھے[2] اپنی محتسبی کے زمانہ میں انھوں نے
لہو و لعب کی جگہیں ختم کرادی تھیں[3]

خلیفہ قاہر ان سے فتویٰ لیا کرتا تھا، ایک مرتبہ صابیوں (ستارہ پرستوں) کے
بارہ میں انکے استفتاء کے جواب میں امام اصطخری نے ان کے قتل کا فتویٰ دیا تھا اور یہود و نصاریٰ
سے ان کا فرق یہ بتایا تھا کہ یہ لوگ ستاروں کو پوجتے ہیں، لیکن یہ ستارہ پرست کسی طرح
اپنی جان بخشی کرانے میں کامیاب ہوگئے[4]

زہد و تقشف اور قضا و احتساب کے عہدوں کی وجہ سے امام اصطخری کے مزاج
میں کسی قدر شدت پسندی بھی تھی[5]

حاضر جوابی امام صاحب بڑے حاضر جواب تھے، ایک مرتبہ امام ابن سریج نے ایک
مجلس میں ان سے مزاحاً کہا کہ دیکھئے فلاں مسئلہ آپ سے پوچھا گیا مگر آپ نے اس کا غلط جواب
دیا، اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ آپ کثرت سے سبزیاں کھاتے ہیں اس کی وجہ سے دماغ
کام نہیں کرتا، امام اصطخری نے فوراً جواب دیا کہ ہاں آپ سرکہ اور مری کثرت سے

[1] طبقات کبریٰ [2] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۹۳ [3] تاریخ بغداد ج ۷ ص ۲۶۹ [4] تاریخ بغداد ج ۱۱
ص ۲۶۸ [5] شذرات الذہب ج ۲ ص ۳۱۲۔

کھاتے ہیں جس سے دین ہی جاتا رہتا ہے (مری، ایک قسم کا کھانا، جو نمک، روٹی، شہد اور سیاہ مرچ سے بلا کر تیار کیا جاتا تھا)۔[1]

تصانیف تذکرہ نگاروں نے انہیں کئی کتابوں کا مصنف بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ان کی کتابیں نفع بخش تھیں مگر صرف ایک ہی کتاب کا ذکر ملتا ہے، جس کا نام ادب القضا یا کتاب القضا یا آداب القضا یا کتاب الاقضیہ ہے، علماء نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی ہے۔[2] امام ابو اسحٰق شیرازی نے اس کو عمدہ کتاب کہا اور امام نووی نے بہترین کتاب سے تعبیر کیا۔[3] امام خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ اس کتاب سے ان کے علم کی وسعت اور فہم کی صحت آشکارا ہے۔[4] ابن کثیر نے اس کو بے مثل کہا[5] اور ابن خلکان کا بیان ہے کہ یہ سب سے اچھی کتاب ہے۔[6] علامہ چلپی نے فقہ شافعی میں ادب القضا پر جن کتابوں کا ذکر کیا ان میں اس کتاب کا ذکر کرنے کے بعد خاص طور سے لکھا کہ فقہ شافعی میں یہی کتاب مشہور ہے اور کوئی اور کتاب اس جیسی نہیں ہے۔[7]

اجتہادی شان دوسرے ممتاز فقہاء شافعیہ کی طرح امام اصطخری نے بھی بعض مسائل میں فقہ شافعی کے مسلمہ اصول سے جدا اپنی رائے دی ہے، امام رافعی نے ان سے کئی ایسے مسائل نقل کیے ہیں جن میں ان کی اپنی اجتہادی شان نمایاں ہے، مثال کے طور پر متوفی عنہا زوجہا (وہ عورت جس کا شوہر انتقال کر جائے) اگر حاملہ ہے تو امام شافعی کے قول کے مطابق اس کا نفقہ اب واجب نہیں ہوگا لیکن امام اصطخری نے فتویٰ دیا کہ عورت کا یہ نفقہ شوہر کے ذمہ واجب ہوگا، جب ان کے اس فتویٰ پر اعتراض کیا گیا اور کہا گیا کہ

---

[1] تاریخ بغداد بحوالہ سابق [2] شذرات الذہب حوالہ سابق [3] طبقات شیرازی ص ۹۱ و تہذیب الاسماء حوالہ سابق [4] تاریخ بغداد [5] البدایہ والنہایہ بحوالہ سابق [6] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۲۹۳ [7] کشف الظنون ج ۱ ص

یہ امام شافعی کا مسلک نہیں ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ چاہے یہ امام شافعی کا مسلک نہ ہو لیکن حضرت علیؓ و حضرت عباسؓ کا مسلک ضرور ہے۔

ان کا ایک قول یہ بھی ہے کہ جو سوار مسافر نہیں بلکہ مقیم ہو وہ نفل نمازوں میں سواری کی حالت میں اگر قبلہ رخ نہیں بھی ہے تو اسکی نماز ہو جائے گی، ان کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح مسافر کو استقبال قبلہ میں تردد ہوتا ہے اسی طرح اس سوار کو بھی ہو سکتا ہے جو اگرچہ اقامت میں ہے مگر چونکہ وہ سواری پر ہے اسلیے نفل نمازوں میں اسکے لیے رخصت ہے، خود وہ جب بغداد کا دورہ اپنی سواری پر کرتے تو انکا عمل اسی کے مطابق ہوتا۔

ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر دو گواہ کسی معاملہ میں قاضی کے سامنے گواہی دیں اور قاضی اس گواہی کو قبول کرنیکے بعد قضیہ کو کسی دوسرے قاضی کیجانب منتقل کر دے اور اس دوسرے قاضی کے سامنے وہ دونوں گواہ اس تحریری گواہی کو پیش کر دیں جسے پہلے قاضی نے قبول کیا تھا تو اب دونوں گواہوں کو نئے سرے سے گواہی دینے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن امام اصطخری اس قول سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ جائز نہیں، بلکہ دونوں گواہوں کو پھر سے گواہی دینا ہوگی۔ امام اصطخری نے بعض اور مسائل میں بھی امام شافعی کے اقوال سے اختلاف کیا ہے، جس سے ان کی اجتہادی شان ظاہر ہوتی۔ اسی اختلاف کی وجہ سے بعض متاخرین نے ان کو کثیر الھفوات کہہ دیا ہے[1] جو نہ صحیح ہے اور نہ اس سے ان کی فقہی عظمت و منزلت پر کوئی اثر پڑتا ہے۔

وفات حدیث و فقہ کی خدمت کرتے ہوئے اور زہد و ریاضت کا پاکیزہ نمونہ پیش کرتے ہوئے تقریباً چوراسی برس کی عمر میں ۳۲۸ھ میں بغداد میں وفات پائی، امام خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ ۱۴ جمادی الاخری بروز پنجشنبہ انتقال ہوا اور جمعہ کے دن نماز جمعہ سے پہلے انکی تدفین ہوئی،[2] مہینہ کے متعلق اختلاف ہے روایات کے مطابق شعبان، جمادی الاولی، ربیع الآخر وغیرہ کے نام لیے گئے ہیں لیکن صحیح یہی ہے کہ یہ جمادی الاخری کا مہینہ تھا، تدفین بغداد کے باب حرب میں ہوئی۔

---

[1] طبقات کبری حوالہ سابق [2] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۷۰۔

موت کہتے ہیں جسے اہلِ زمیں کیا راز ہے؟

از

جناب محمد بدیع الزماں صاحب

دنیوی اور اخروی دونوں زندگیوں میں فلاح اور خسران کا انحصار صرف تخلیق انسانی کے مقاصد اور موت کے رازِ نہاں کو سمجھنے اور نہ سمجھنے پر ہے۔ قرآن مجید میں ان دونوں باتوں پر مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ انسان کے جینے اور مرنے میں خدا نے کچھ مصلحتیں رکھی ہیں جن کا براہِ راست تعلق تخلیق کائنات سے ہے۔ موت کوئی سانحہ نہیں بلکہ قرآن مجید میں مذکور زندگی کے تین مراحل میں ایک مرحلہ ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ یہ صرف درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف گزرتے چلے جانے کا نام ہے:

"پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی، اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی جب کہ وہ ماہ کامل ہو جاتا ہے، تم کو ضرور درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف گذرتے چلے جانا ہے" (سورۃ الانشقاق ۸۴۔ آیت ۱۶ تا ۱۹)

"اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے، اسی میں ہم تمھیں واپس لے جائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے" (سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۵۵)

"تم اللہ کے ساتھ کفر کا رویہ کیسے اختیار کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے، اس نے تم کو زندگی عطا کی، پھر وہی تمھاری جان سلب کرے گا، پھر وہ تمھیں دوبارہ زندگی عطا کرے گا، پھر

اسی کی طرف تم کو پلٹ کر جانا ہے" (سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۲۸)

یہ کہ ہر انسان کو ان تین مراحل (یعنی زندگی، موت اور حیات بعد الممات) سے گزرنا ہوگا۔ اس کی آگاہی جنت سے اخراج کے وقت ہی انسان کو دے دی گئی تھی فرمایا گیا تھا کہ:۔

"اتر جاؤ، تم ایک دوسرے (انسان اور شیطان) کے دشمن ہو اور تمھارے لیے ایک خاص مدت تک زمین ہی میں جائے قرار اور سامان زیست ہے"۔ اور فرمایا: "وہیں تم کو جینا اور وہیں مرنا ہے اور اسی میں سے تم کو آخر کار نکالا جائے گا"۔ (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۲)

زندگی کے ساتھ موت کے مرحلہ سے گزرنے کی وجہ خدائے تعالیٰ نے ایک موقع پر یہ بتائی ہے کہ:۔

"نہایت برتر و بزرگ ہے وہ جس کے ہاتھ میں (کائنات کی) سلطنت ہے، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے"۔ (سورۃ الملک ۶۷۔ آیت ۱ و ۲)

اقبال نے موت کے معاملے میں اسی آیت کی طرف "بانگ درا" کی نظم "خفتگانِ خاک سے استفسار" کے درج ذیل شعر میں عام انسان کو غور و فکر کی دعوت دی ہے کیونکہ وہ دنیا کی چند روزہ زندگی ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے اور موت اور اس کے راز سے دانستہ طور پر ناواقف رہتا ہے ؎

کیا عوضِ رفتار کے اس دیس میں پرواز ہے؟
موت کہتے ہیں جسے اہلِ زمیں، کیا راز ہے؟

زندگی کے بعد موت کا لابدی ہونا قیامت کے یقینی طور پر وقوع پذیر ہونے اور حیات بعد الممات پر دلالت کرتا ہے۔ ورنہ زندگی کے ساتھ موت ایجاد نہ کی جاتی، اور یہ نہیں فرمایا جاتا کہ:۔

"ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے، پھر تم سب ہماری ہی طرف پلٹا کر لائے جاؤ گے۔"

(سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۵۷)

موت کا رازِ نہاں یہ بھی ہے کہ جس وقت موت آتی ہے یہ حق لے کر آ پہونچتی ہے۔ فرمایا گیا:-

"پھر دیکھو، وہ موت کی جان کنی حق لے کر آ پہنچی، یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔ اور پھر صور پھونکا گیا، یہ ہے وہ دن جس کا تجھے خوف دلایا جاتا تھا۔ ہر شخص اس حال میں آگیا کہ اس کے ساتھ ایک ہانک کر لانے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا۔ اس چیز کی طرف سے تو غفلت میں تھا، ہم نے وہ پردہ ہٹا دیا جو تیرے آگے پڑا ہوا تھا اور آج تیری نگاہ خوب تیز ہے" (سورۃ قٓ ۵۰۔ آیت ۱۹ تا ۲۲)

حق لے کر آ پہنچنے سے مراد یہ ہے کہ موت کی جان کنی وہ نقطۂ آغاز ہے جہاں سے وہ حقیقت کھلنی شروع ہو جاتی ہے جس پر دنیا کی زندگی میں پردا پڑا ہوا تھا۔ موت خود سے نہیں آتی بلکہ یہ اللہ ہی ہے جو موت کے وقت روحیں قبض کرتا ہے۔ روح قبض کرنے کی کیفیات بھی، جو قرآن مجید میں وارد ہوئی ہیں، موت کے رازِ نہاں پر روشنی ڈالتی ہیں ایک موقع پر فرمایا گیا کہ:-

"وہ اللہ ہی ہے جو موت کے وقت روحیں قبض کرتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا ہے اس کی روح نیند میں قبض کر لیتا ہے، پھر جس پر وہ موت کا فیصلہ نافذ کرتا ہے اسے روک لیتا ہے اور دوسروں کی روحیں ایک وقت مقرر کے لیے واپس بھیج دیتا ہے۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔" (سورۃ الزمر ۳۹۔ آیت ۴۲)

نیند کی حالت میں روح قبض کرنے سے مراد احساس و شعور، فہم و ادراک اور اختیار و ارادہ کی قوتوں کو معطل کر دینا ہے۔ نیند میں روح قبض کر لینے کی اسی کیفیت کو اور کسی کی اسی حالت میں روح قبض کر لینے اور کسی کی نہ کرنے کی بات سے موت ایک حالت سے دوسری حالت میں گذرنے کا ایک معمولی سا واقعہ ہے جو انسانی زندگی میں پیش آتا ہے۔ اسی نکتہ کو اسی آیت کے پس منظر میں اقبال نے "بانگ درا" کی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کے درج ذیل اشعار میں اس طرح ذہن نشین کرایا ہے:-

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے — ذوق حفظ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقش حیات — عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظام کائنات

ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں — جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

آہ غافل! موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے!

نقش کی ناپائداری سے عیاں کچھ اور ہے!

موت کے وقت روح قبض کرنے کی اور بھی جو کیفیات بیان فرمائی گئی ہیں وہ بھی اس راز سے پردہ اٹھاتی ہیں جن پر انسان اپنی دنیوی زندگی میں غور و فکر نہیں کرتا۔ ارشاد ہے:

"قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو ڈوب کر کھینچتے ہیں (وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا)، اور آہستگی سے نکال لے جاتے ہیں (وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا)، اور (ان فرشتوں کی جو کائنات میں) تیزی سے تیرتے پھرتے ہیں، پھر (حکم بجالانے میں) سبقت کرتے ہیں" (سورۃ النّٰزعٰت ۷۹۔ آیات ۱ تا ۴) "(اے نبیؐ)، ان منکروں اور کافروں) کو کہو:

"موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تم کو پورا کا پورا اپنے قبضہ میں لے گا اور پھر تم اپنے رب کی طرف پلٹا لائے جاؤ گے۔" (سورۃ السجدۃ ۳۲۔ آیت ۱۱)

ان آیات میں بہت سے حقائق پر جو موت کے وقوع پذیر ہونے سے متعلق ہے، روشنی
ڈالی گئی ہے۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے موت سے انسان معدوم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی روح جسم سے
نکل کر باقی رہتی ہے کیونکہ کوئی معدوم چیز قبضے میں نہیں لی جاتی۔ قبضے میں لینے کا تو مطلب ہی
یہ ہے کہ مقبوضہ چیز قابض کے پاس رہے۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت جو
چیز قبضہ میں لی جاتی ہے وہ آدمی کی حیوانی زندگی نہیں بلکہ اس کی ذات خودی، اس کی وہ
انا ہے جو "میں" اور "ہم" اور "تم" کے الفاظ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ یہ انا دنیا میں کام کرکے جیسی
کچھ شخصیت بھی بنتی ہے وہ پوری کی پوری نکال لی جاتی ہے بغیر اس کے کہ اس کے اوصاف میں
کوئی کمی بیشی ہو اور یہی چیز موت کے بعد اپنے رب کی طرف پلٹائی جاتی ہے۔ اسی کو آخرت میں
نیا جنم اور نیا جسم دیا جائے گا، اسی سے حساب لیا جائے گا اور اسی کو سزا و جزا دیکھنی ہوگی۔
حساب کس چیز کا لیا جائے گا یہ بات سورۃ الملک، ۶۷ کے رکوع ا کی آیات میں، جو اس مضمون
میں پہلے گزر چکی ہیں، خدا نے بتا دی ہے کہ موت اور زندگی کو ایجاد ہی اس لیے کیا گیا ہے
تاکہ "تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے"۔ چنانچہ جب موت
کا فرشتہ انسان کی روح کو پورا کا پورا قبضے میں لے کر خدا کے حضور حاضر کرے گا تو
اس وقت ان لوگوں کی کیفیات جو دنیا کی عارضی زندگی کو کھیل اور تماشا سمجھتے رہے تھے اور
موت اور اس کے رازِ نہاں سے غافل تھے سورۃ السجدہ (۳۲) کی آیت (۱۲) میں یہ بیان فرمائی گئی ہیں کہ:

"(اے نبیؐ)، کاش تم دیکھو وہ وقت جب یہ مجرم سر جھکائے اپنے رب کے حضور کھڑے
ہوں گے۔ (اس وقت یہ کہہ رہے ہوں گے) "اے ہمارے رب، ہم نے خوب
دیکھ لیا اور سن لیا، اب ہمیں واپس بھیج دے تاکہ ہم نیک عمل کریں، ہمیں اب
یقین آگیا ہے"۔

اس کے جواب میں ارشاد ہوگا کہ:۔

"اگر ہم چاہتے تو پہلے ہی ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے۔ مگر میری وہ بات
پوری ہوگئی جو میں نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں، سب سے بھر دونگا
پس اب چکھو مزا اپنی اس حرکت کا کہ تم نے اس دن کی ملاقات کو فراموش کر دیا، ہم
نے بھی اب تمھیں فراموش کر دیا ہے۔ چکھو ہمیشگی کے عذاب کا مزا اپنے کرتوتوں کی
پاداش میں"۔ (سورۃ السجدۃ ۳۲۔آیات ۱۳ اور ۱۴)

اس دن مجرموں کو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ خدا نے زندگی کے ساتھ موت کو کیوں ایجاد کیا
اور روح قبض کرتے وقت موت کے فرشتہ کو ڈوب کر کھینچنے اور آہستگی سے روح کو
پورا کا پورا قبضہ میں لے کر اپنے حضور حاضر کرنے کی تاکید کیوں کی تھی۔ اس دن مجرموں کو یہ
بھی پتہ چل جاتا ہے کہ موت سے انسانی زندگی معدوم نہیں ہوتی بلکہ اس کی شخصیت،
جیسی اس نے دنیا میں بنا رکھی تھی وہ جوں کی توں خدا کے حضور حاضر کر دی گئی ہے۔ روح
کے قبض کرنے کی ان ہی کیفیات اور انسانی وجود کو جوں کا توں باقی رکھنے کے ان ہی قرآنی
نکتوں کی ترجمانی اقبال نے "ضرب کلیم" کی نظم "موت" کے اس شعر میں کی ہے ۔

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے!

جس وقت انسان کی موت واقع ہوتی ہے اس وقت خدا مرنے والے سے زیادہ
قریب ہوتا ہے اور اسی وقت وہ فیصلہ کر چکا ہوتا ہے کہ مرنے والا اس کے ذریعہ مقرر کیے گئے
تین درجوں میں کس درجہ میں داخل ہونا ہے۔ ایک درجہ مرنے والوں میں مقربین کا ہے،
دوسرا اصحاب یمین کا اور تیسرا جھٹلانے والوں کا۔ موت کے وقت ان کا استقبال

کس طرح ہوا کرتا ہے یا ضیافت کس طرح کی جاتی ہے اسے درجہ بدرجہ سورۃ الواقعہ ۵۶ کے رکوع ۳ کی درج ذیل آیات میں بیان فرمایا گیا ہے کہ :۔

"اب اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو اور اپنے اس خیال میں سچے ہو، تو جب مرنے والے کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے، اس وقت اس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے؟ اسوقت تمہاری بہ نسبت ہم اس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے۔ پھر وہ مرنے والا اگر مقربین میں سے ہو تو اس کے لیے راحت اور عمدہ رزق اور نعمت بھری جنت ہے، اور اگر وہ اصحاب یمین میں سے ہو تو اس کا استقبال یوں ہوتا ہے کہ سلام ہے تجھے، تو اصحاب الیمین میں سے ہے اور اگر وہ جھٹلانے والے گمراہ لوگوں میں سے ہو تو اس کی تواضع کے لیے کھولتا ہوا پانی ہے اور جہنم میں جھونکا جانا۔" (آیت ۸۳ تا ۹۶)

اقبال جب خفتگانِ خاک سے یہ استفسار کرتے ہیں کہ: "موت کہتے ہیں جسے اہلِ زمیں کیا راز ہے؟" تو وہ انسانی ذہن کو ان ہی سارے قرآنی ارشادات کی طرف مبذول کراتے ہیں اور ان ہی قرآنی تصورات کی تحت نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" میں ان نکتوں کی مزید وضاحت اس طرح کرتے ہیں:۔

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے!

خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں!
موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں!

وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات
جلوہ گاہیں اسکی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات

مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے!

ہے وہاں بے حاصلی کشتِ اجل کے واسطے
سازگار آب و ہوا تخمِ عمل کے واسطے

اخبارِ علمیہ

انیسویں صدی میں ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد ہی سے انگریزی اور اردو کے لغات کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ چنانچہ فاربس، فیلن اور پلاٹس نے ابتدائی لغات تیار کیے، پھر انگریزی سے اردو میں ایک جامع اور مستند لغت بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ۱۹۳۷ء میں شائع کیا، اس کے بعد بھی اچھی اور جامع اردو انگریزی لغت کی ضرورت باقی تھی۔ اب مقتدرہ پاکستان کے جریدہ 'اخبار اردو' کے ایک مضمون سے معلوم ہوا کہ مرحوم ریاست حیدرآباد دکن کے ایک وظیفہ یاب ڈپٹی ڈائرکٹر آف ٹرانسلیشن جناب یعقوب میراں مجتہدی جو برسوں سے اسکی تکمیل میں منہمک تھے، اب اس منصوبہ کو مکمل کر چکے ہیں، ۱۳ ہزار صفحات میں سے ۱۱ ہزار اب تک ٹائپ ہو چکے ہیں، خیال ہے کہ تین ہزار صفحات پر مشتمل یہ لغت تین جلدوں میں آئندہ سال کے وسط تک مشہور ناشر اورینٹ لانگ مین کے زیر اہتمام چھپ کر شائع ہو جائے گا، کسی فردِ واحد کی یہ جاں کاہی، محنت اور لگن یقیناً قابل قدر اور لائق تحسین ہے۔

حال ہی میں ادارہ ایشین ایجوکیشنل سروسز نے انگریزی، اردو اور ہندی کا ایک قدیم لغت از سرِ نو شایع کیا ہے، جس کو انیسویں صدی کے وسط میں بنارس کے کوئن کالج کے ایک استاد متھرا پرشاد مسرا نے اسلیے مرتب کیا تھا کہ انگریزی حکومت میں کالجوں، یونیورسٹیوں اور عدالتوں میں انگریزی زبان کی ضرورت و اہمیت بڑھ گئی تھی اور یہ اس وقت کے طلبہ، اساتذہ اور وکلاء کے لیے کار آمد ہو۔ اس وقت اسے کسی بھی اینگلو ہندوستانی لغت سے بہتر سمجھا جاتا تھا مترادف الفاظ، توضیحی حواشی، معانی کے ساتھ تلفظ اور صرفی و نحوی استعمال کی علامتوں کو

ایجاز و اختصار سے ظاہر کیا گیا تھا، اصل کتاب ۱۲۳۶ صفحات پر مشتمل ہے اس کے علاوہ ۸۰ صفحات میں انگریزی میں رائج ان لفظوں کا ذکر ہے جو لاطینی، یونانی اور دوسری زبانوں کے ہیں، سنسکرت کی قدامت و اہمیت کے اعتراف کے باوجود مولف نے لکھا تھا کہ اسکے حوالہ سے الفاظ کے ہندو یوروپی الاصل ماخذ کا پتہ لگانا دشوار ہے۔ ٹائمز آف انڈیا کے تبصرہ نگار نے اسکے جدید ایڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس لغت میں کمیونزم، کمیونلزم اور سوشلزم جیسے الفاظ ہی نہیں، ڈیمانسٹریشن کا مطلب استدلال اور اثبات مندرج ہے، مظاہرہ کا لفظ اسوقت رائج نہیں ہوا تھا۔

الفاظ کے معانی پر وقت کے تغیرات کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اس کا ایک مظہر سادھو سنت اور مہنت کا لفظ ہے، پہلے یہ لفظ تقدس، احترام، ترک علائق و ترک نفس کے مطالب کا حامل سمجھا جاتا تھا مگر اب یہ لفظ سادھو سنتوں کے جذبۂ حصول دولت، جائداد کی ہوس اور ناحق خوں ریزی کی وجہ سے اپنی معنویت کھوتا نظر آتا ہے، ٹائمز آف انڈیا کے ایک مضمون نگار یوگیش باجپئی نے اجودھیا کے مہنتوں کے متعلق لکھا ہے کہ ان میں سے اکثر مکروہ جرائم کے مرتکب ہو رہے ہیں، گذشتہ ماہ جانکی گھاٹ کے ۸۵ سالہ معمر مہنت متھالی سرن داس کو کروروں کی جائداد کے لالچ میں ان کے ایک چیلے نے بہیمانہ طور پر قتل کر دیا، ایک اعلیٰ پولیس آفیسر نے کہا کہ ہر ہفتہ عشرہ میں کسی نہ کسی مٹھ میں ایک دو لاشوں کا ملنا عام بات ہے اور دو درجن سے زیادہ مہنت مجرمانہ کردار کے حامل ہیں، ہنومان گڑھی کے مہنت رام کھلاون داس نے اجودھیا کو چمبل کی وادی سے تعبیر کیا، گو موجودہ دور میں ان جرائم کا زیادہ چرچا ہو رہا ہے لیکن بقول یوگیش باجپئی، "جرائم کی یہ روایت قدیم ہیں" مہنتوں کی خون خرابہ کی عادتوں اور مجرمانہ حرکتوں نے ان کے وقار کو مجروح کر دیا ہے اور شاید اسی لیے وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل کے لوگ مورو ملخ کی طرح اجودھیا پر

حملہ آور ہو رہے ہیں اور بر سر عام ان مذہبی پیشواؤں کو برا بھلا اور سخت و سست کہتے ہیں"۔

اجودھیا کی تاریخی حیثیت خواہ کچھ ہو لیکن اس وقت وہ کئی تاریخی واقعات و حوادث کی ذمہ دار ضرور ہے، انڈین ہسٹری کانگریس، ہندوستان کے مورخین کا ایک موقر اور تقریباً نصف صدی پرانا ادارہ ہے، اس کے اراکین میں ایس کے آئنگر، ڈی آر بھنڈارکر، محمد حبیب، ڈاکٹر تاراچند، پروفیسر بشیشور پرساد، پروفیسر نور الحسن، پروفیسر ستیش چندر، پروفیسر بپن چندرا اور پروفیسر عرفان حبیب وغیرہ ممتاز مورخ شامل ہیں، یہ ادارہ اپنے اجتماعات کے انعقاد کی پابندی و تسلسل میں بھی بہت ممتاز ہے اس کی ۵۲ سالہ تاریخ میں صرف دوسری جنگ عظیم اور ۱۹۷۱ء کی ہند و پاک جنگ کے دو موقع ایسے آئے جب اس کا سالانہ اجتماع نہ ہو سکا، اس سال اجین مدھیہ پردیش میں ۲۸۔۳۰ دسمبر کو اس کا جلسہ ہونے والا تھا مگر مدھیہ پردیش کی بی جے پی حکومت کے مالی عدم تعاون کیوجہ سے اسے ملتوی کرنا پڑا، ذمہ داروں کا خیال ہے کہ ایسا محض اسلیے کیا گیا کہ بابری مسجد کے تنازعہ میں ان مورخین نے مسجد کی عمارت کو علی حالہ قائم رکھنے کی قرارداد منظور کی تھی، آزادیٔ فکر و رائے کے اس دور میں بھی سیاسی ترغیب و ترہیب کا یہ حال ہے کہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے ریڈر بی، پی ساہو کے مطابق اس کانگریس کے متعدد اراکین کو وشو ہندو پریشد کے نظریۂ ہندویت کی تائید میں مقالات لکھنے کے لیے ۵۰۰ روپیہ فی صفحہ کی پیشکش کی گئی تھی، گذشتہ برس گورکھپور میں اسی کانگریس کے جلسہ میں ایک مقامی سیاسی مہنت نے بن بلائے شریک ہو کر نہایت جذباتی تقریر کی تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ انصاف پسند مورخین کے اس قدیم ادارہ کو بے اثر کرنے کیلئے احیائیت پسندوں نے اتہاس سمتی دھک منڈل جیسے متوازی ادارے قائم کیے ہیں جن کو مال و دولت کے بل بوتے پر تاریخ سازی کے لیے نمایاں کیا جا رہا ہے۔

دیومالائی افسانوں اور غیر مستند روایتوں کو تاریخ کے مستند واقعات میں تبدیل کرنے کی یہ دانستہ وشعوری کوششیں گو تشویش ناک ہیں لیکن حق پسند افراد اب بھی حق وصداقت کے آئینہ کا غبار دور کرنے میں مصروف ہیں، ٹائمز آف انڈیا کے ایک مضمون میں پی بی ورمانے لکھنؤ، گورکھپور اور الٰہ آباد جیسے شہروں میں متعدد مندروں، خانقاہوں اور مزاروں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انکی تعمیر میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک رہے، لکھنؤ میں علی گنج کے مشہور ہنومان مندر کو نواب سعادت علی خاں کی والدہ نے بنوایا تھا اس مندر پر ہلالی نشان خود ہندو مسلم اتحاد کی روشن علامت ہے، نواب آصف الدولہ نے ۱۷۷۵ء میں شیتلا دیوی کے مندر کو از سر نو آباد کیا اور چنہٹ کے قریب جگن ناتھ مندر کو تعمیر کرایا، اسی طرح بعض مزاروں اور خانقاہوں کو خود ہندوؤں نے آباد کیا اور آج تک ان سے ان دونوں فرقوں کا سماجی اور خوش عقیدگی کا رشتہ قائم ہے، پی بی ورمانے بجا طور پر ان مقامات کو ”جزائر امن“ سے تعبیر کیا ہے۔

امن و آشتی کے جزیروں کی تلاش یقیناً قابل تحسین کوشش ہے، لیکن جب قلوب سمجھنے کے لیے اور کان سننے کے لیے تیار نہ ہوں تو کلام نرم ونازک کی بے اثری پر افسوس فطری امر ہے موجودہ دور میں انسان کی قوت سماعت یوں بھی کمزور ہوتی جاتی ہے، امریکا کے ایک سروے سے معلوم ہوا کہ ۳۰ برس سے زیادہ کی عمر والے مرد، عورتوں کے مقابلہ میں دوگنی رفتار سے اپنی قوت سماعت سے محروم ہو رہے ہیں اور مجموعی طور پر موجودہ نسل، عمر کے ہر مرحلہ پر پرانی نسل کے مقابلہ میں زیادہ بہری ہوتی جاتی ہے۔ پورٹ لینڈ یونیورسٹی کے شعبۂ امراض گوش کے چیرمین پروفیسر الیکزنڈر شوے ننگ اس جائزہ کی توثیق کے لیے مزید تحقیقات میں مصروف ہیں۔ کاش دلوں کی غفلت کے اسباب کا بھی کوئی سائنسی تجزیہ کیا جاتا۔

ع۔ص۔

آثار علمیہ وتاریخیہ

عدالت میں مولانا حمید الدین فراہیؒ کا حلفی بیان

از ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی

۱۹۸۵ء میں میں نے مولانا فراہیؒ کے حالات وباقیات کی جستجو میں ہندوستان کا آخری سفر کیا۔ اس سفر میں میرا ایک ہدف اس مشہور مقدمہ کی مسل کو تلاش کر کے اصل حقائق تک رسائی حاصل کرنا تھا جو مولانا فراہیؒ کے والد اور ان کے ایک قریبی عزیز کے درمیان چلتا رہا اور جس میں مولانا فراہیؒ نے ثالث بن کر اپنے والد کے خلاف فیصلہ دیا تھا اور جس کے نتیجے میں اچھی خاصی جائداد ان کے والد کے ہاتھ سے نکل گئی جو بعد میں خود مولانا فراہیؒ کو ملنے والی تھی۔ یہ مولانا فراہیؒ کی سوانح حیات کا ایک مہتم بالشان واقعہ سمجھا جاتا ہے اور اس واقعہ میں متعدد ایسی جہتیں ہیں کہ اگر پوری تحقیق اور بے لاگ تنقید سے اس کے تمام گوشوں کو بے نقاب کر کے حقائق کو ان کے اصلی رنگ میں بیان نہ کیا جائے تو آج سے ایک صدی پیشتر کے مسلمان معاشرے میں بھی امکان عادی اور امکان عقلی کے ہوتے ہوئے، اسے افسانہ کہہ کر آسانی سے بات ختم کی جاسکتی ہے۔ اس لیے شروع ہی سے، حالات کی نامساعدت اور وسائل کے فقدان کے باوجود میں نے اس مقدمے کو ان اہداف میں شامل کر لیا جن کے پیچھے میں برسوں لگا رہا اور پانچ سال کی طویل مدت گذرنے کے بعد بالآخر مجھے وہ دفینہ مل گیا۔ لیکن اس دفینے کی دریافت سے قبل مجھے، ”آگ لینے کو جائیں، پیمبری مل جائے“ کے بمصداق ایک اور خزانہ مل گیا۔

جو مولانا فراہیؒ کی سوانح حیات کے سلسلہ میں بیش بہا گنجینہ سے کم نہیں۔ یہ ایک حلفی بیان ہے جو مولانا نے اعظم گڈھ کی ایک عدالت کے روبرو دیا اور جس کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف وہ ماہر فن لگا سکتا ہے جس نے تلاش و تحقیق کے سمندر میں غواصی کی ہو۔ میں نے سمندر کی تہہ سے یہ موتی کیسے نکالے۔ اس کی روداد قلمبند کروں تو دلچسپ ہونے کے باوجود وہ مجھے اور آپ کو مقصد سے دور کر دے گی۔ اس وقت میرا مقصد وحید مولانا کے اس بیان کو شایع کر کے محفوظ کر دینا ہے جو ان کے سوانح کا سب سے اہم بنیادی، مستند اور معتبر ماخذ ہے۔ تاہم ان اصحاب کا ذکر نہ کرنا بڑی کوتاہی اور ناشکری ہوگی جو اسباب کی اس دنیا میں اس خزانے تک میری رسائی کا ذریعہ بنے۔ ان میں سب سے پہلا قابل ذکر نام برادرم اقبال سلمہ اللہ تعالیٰ[1] کا ہے اس لیے کہ میری نسبت سے سلسلے کی پہلی کڑی وہی ہیں۔ دوسرے درجے میں ضلع اعظم گڈھ کا ایک معروف گاؤں آنوک موضع کے محمد خالق صاحب کا نام آتا ہے جو ایک کلرک کی معمولی حیثیت میں اعظم گڈھ کی دیوانی کچہری میں ملازم تھے اور تیسرے درجے میں اور اگر ترتیب الٹ دی جائے تو پہلے درجے میں کچہری کے ایک چپراسی کا نام آتا ہے، جس نے سو سال پرانی فائلوں پر جمے ہوئے گرد و غبار کو پھانک پھانک کر مسلسل کئی روز کی محنت شاقہ کے بعد اسے ڈھونڈ نکالا۔

میں بے شک اسلام آباد سے اعظم گڈھ ہزار میل سے زیادہ کی مسافت طے کر کے گیا تھا اور اسی مقصد سے گیا تھا لیکن میری حیثیت ایک اسکالر کی تھی۔ یہ میرا پیشہ تھا۔

---

[1] یہ مقالہ نگار کے عم زاد بھائی ہیں جو سنجر پور اعظم گڈھ کے رہنے والے اور اس وقت مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں انگریزی کے استاذ ہیں۔

فرض منصبی تھا۔ میں نے عمر بھر اس کی تربیت حاصل کی تھی اور زندگی کا بڑا حصہ اسی دشت کی سیاحی میں گزرا تھا۔ میں بلا ادنیٰ شائبہ تکلف کہوں گا کہ میں دل کی گہرائیوں سے ان تینوں عزیزوں کو آفریں کہتا ہوں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا اور سلام کہتا ہوں ان کے اس گمنام جذبے اور شعور کو جس کے لیے اردو زبان کے وسیع ذخیرے میں مجھے کوئی موزوں لفظ نہیں نظر آتا۔ اور جس کی تحریک کے زیر اثر انھوں نے میری زبان سے نکلے ہوئے مبہم اشارات کو اس بالغ نظری کے ساتھ سمجھا اور اس کو عملی جامہ پہنایا کہ جو سنے عش عش کر اٹھے۔

اس کوہ کنی میں میرا حصہ بس اتنا ہی ہے کہ میں نے عرض مدعا کے لیے اپنی زبان کو حرکت دی۔ اور پھر پلٹ کر پوچھا تک نہیں لیکن ان عزیزوں نے میری زبان سے نکلے ہوئے حرف مطلب کو اس طرح گرہ میں باندھ لیا کہ مجھے فکر کرنے اور دوبارہ سہ بارہ کہنے کی ضرورت بھی پیش نہ آئی میں ان لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔

اس مقدمے کے ایک فریق مدعا علیہ شیخ محمد ہیں۔ جو مولانا فراہیؒ کے عم محترم حاجی سلیم صاحب کے بیٹے تھے۔ ایک بڑے زمیندار ہونے کی حیثیت سے دیار میں ان کی بڑی شہرت تھی۔ وہ عرصہ تک شبلی نیشنل اسکول کے سکریٹری بھی رہے۔ مقدمے کی دوسری فریق بطور مدعی خدیجہ بی بی ہیں جو شیخ صاحب کی حقیقی اور مولانا فراہیؒ کی چچازاد بہن تھیں۔ اس بیان میں ایک اور نام مرزا صدر الدین کا آتا ہے جو مولانا فراہیؒ کی پھوپھی زاد بہن کے بیٹے تھے۔ باقی نام وکلا اور افسران عدالت کے ہیں۔ نقل مطابق اصل بعدالت سب جج مقام۔ ضلع اعظم گڈھ۔

مقدمہ نمبر ۴۳۴ بابت ۱۹۰۹ء گواہ نمبر ۱ ۱۹۳-الف

نام فریقین خدیجہ بی بی مدعیہ بنام شیخ محمد وغیرہ مدعاعلیہم

اظہار مولوی حمید الدین گواہ مدعیان واقع ۲۰ جون ۱۹۱۰ء بحلف ایکٹ نمبر ۱۰ ۱۸۷۳ء

معرفت جگر چپراسی کے حلف دیا گیا بہ اجلاس بابو رام چندر چودری صاحب بہادر سب جج

مظہر کا نام مولوی حمید الدین باپ کا نام عبد الکریم قوم شیخ

سکونت موضع پھریہا عمر تخمیناً للعہ[1] ۴۶ برس پیشہ پروفیسر میور کالج الہ آباد بیان کیا

میں پروفیسر عربی و فارسی کا، میور سنٹرل کالج الہ آباد میں ہوں۔ میری ماہواری

تنخواہ مبلغ دو سو روپیہ ہے۔ میں نے انگریزی میں B. A. تک ڈگری الہ آباد یونیورسٹی

سے حاصل کیا ہے۔ میں اس وقت تفسیر کلام مجید کی عربی زبان میں لکھ رہا ہوں، اور بھی

بہت میری تصنیفات ہیں۔ جس وقت لارڈ کرزن صاحب بہادر خلیج فارس میں تشریف

لے گئے تھے اس وقت میں صاحب ممدوح کے اسپیچ و ایڈریس کا مترجم عربی زبان کا تھا

حاجی محمد سلیم[2] صاحب مرحوم میرے حقیقی چچا تھے۔ آخر مرتبہ حاجی محمد سلیم صاحب میرے مکان

پر، مدت دراز تک، الہ آباد میں، بحالت بیماری کے مقیم تھے، مگر میں نہیں کہہ سکتا ہوں کہ

کتنے دنوں تک۔ دو ڈھائی، یا تین مہینہ تک مقیم تھے۔ عید و بقرعید کے درمیان میں مقیم

رہے اور غالباً بقرعید کے قبل چلے آئے۔ ان کی وفات کے پہلے جو آخر بقرعید پڑی تھی اسکے

بعد کوئی بقرعید ان کی زندگی میں نہیں پڑی۔ اس وقت حاجی صاحب بیمار تھے۔ ان کا

علاج وہاں ڈاکٹری ہوتا تھا، غالباً S. P. Roy کا ہوتا تھا۔ جہانتک مجھکو معلوم ہے

حاجی صاحب الہ آباد میرے مکان سے موضع پھریہا واپس آئے۔ وہ اپنے مکان پر

---

[1] اصل بیان میں یہ عدد رقم میں ہے [2] معارف موصوف علوم عربیہ کے فاضل اور وکیل تھے۔ جو مسلکاً اہل حدیث اور صاحب تصانیف بھی تھے۔

تھے صرف محمد ساتھ الہ آباد شیخ محمد ان کے بیٹے تھے۔ صرف محمد

اعظم گڈھ[1] یا پھریہا آئے۔ حاجی صاحب کے پاس بیٹھا رہا کرتا تھا۔ دبلے ہو گئے تھے اور

تھے۔ بیشتر اوقات میں حاجی صاحب کے پاس بیٹھا رہا کرتا تھا۔ دبلے ہو گئے تھے اور

ہاتھ پیر میں ورم تھا۔ پہلے وہ چل پھر سکتے تھے مگر . . . سے جاتے تھے۔ بعدہ وہ مشکل

سے چل سکتے تھے اور اکثر پڑے رہتے تھے۔ حاجی صاحب کے پیشاب میں سفید مادہ

بیٹھ جاتا تھا اور اس کی وجہ سے طاقت گھٹتی جاتی تھی۔ وہ روزانہ اپنا پیشاب ایک اوالہ

سے جوان کے پاس تھا اس کا امتحان کرتے تھے۔ نوکر پیشاب لاتا تھا اور حاجی صاحب

اس میں ایک دوا ڈالتے تھے اور اس کی جو حالت ہوتی تھی اس کو دیکھتے تھے۔ سوال

اور کوئی علالت آپ نے حاجی صاحب میں دیکھا تھا۔ جواب۔ ایک دو مرتبہ ایسا

ہوا کہ رات کو حاجی صاحب کے ہاتھ میں حرکت نہیں ہوئی اور کچھ مالش کرنے کے

بعد اس میں پھر حرکت پیدا ہوئی۔ حاجی صاحب مولوی محمد اسحاق وکیل[2] سے اپنی

جائداد کے متعلق مشورہ کرتے تھے۔ میں اکثر اوقات میں موجود نہیں تھا اور جب

بعض اوقات میں موجود تھا (اور دوسرا کوئی شخص نہیں تھا۔) اپنی جائداد کے متعلق

انھوں نے مجھ سے گفتگو کی جس میں میں نے اسے کچھ رائے دینا مناسب نہیں سمجھا۔

محمد کے غیب میں مجھ سے گفتگو ہوئی تھی۔ محمد اس جگہ نہیں تھے۔ میں اور حاجی صاحب

تنہا تھے۔ محمد الہ آباد میں موجود تھے مگر اس موقع پر موجود نہیں تھے جہاں مجھ سے

اور حاجی صاحب سے گفتگو ہوئی تھی، مجھ سے اور حاجی صاحب سے تنہائی میں گفتگو

ہوئی تھی۔ حاجی صاحب مجھ سے ایسے راز کی بات کرتے تھے کہ وہ محمد کے آنے کی آواز

---

[1] معارف پھریہا اور اعظم گڈھ شہر دونوں جگہ انکے مکانات تھے [2] معارف علامہ شبلیؒ کے برادر خورد جو انکی زندگی ہی میں وفات پا گئے تھے اور مولانا نے ان کا نہایت پر درد مرثیہ کہا تھا۔

سنتے تھے تو چپ ہو جاتے تھے ایسے راز کی باتیں جو صرف مجھ سے تنہائی میں کہنا چاہتے تھے اس کو میں عدالت میں، علانیہ ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا۔ سوال۔ دوران گفتگو میں حاجی صاحب نے اپنی جائداد کی نسبت اپنے ورثاء کے متعلق کوئی رائے یا خیال کا اظہار آپ سے کیا تھا یا نہیں، اگر کیا تھا تو کیا کیا تھا۔ جواب۔ وہ چاہتے یہ تھے کہ ان کی جائداد کا اس طرح سے انتظام کیا جاوے کہ اور لوگ جو حق رکھتے ہیں ان کی حق تلفی نہ ہو۔ ان کو یہ مشکل درپیش تھی کہ کس طریقہ پر اس کا انتظام کیا جاوے کہ دیگر مستحقین کی حق تلفی نہ ہو اور مختلف صورتیں وہ سوچتے تھے، مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی قطعی فیصلہ تک وہ نہیں پہنچے تھے۔ سوال۔ آپ کے مواجہہ یا آپ کے علم میں، نسبت جائداد حاجی صاحب کے، کوئی تحریک یا اصرار، منجانب شیخ محمد مدعاعلیہ کے، حاجی صاحب سے ہوا تھا یا نہیں۔ اگر ہوا تھا تو کیا۔ جواب۔ میرے سامنے نہیں ہوا تھا، میرے علم میں ہوا تھا۔ یہی اصرار محمد کا تھا کہ جو کچھ کرنا ہے وہ کر دیں۔ محمد یہ چاہتے تھے کہ جو کچھ حاجی صاحب کرنا چاہتے ہیں وہ کر دیں۔ واپسی کے وقت محمد و غالباً دو ملازم جو ان کے ساتھ آتے۔ ان کی واپسی کے بعد سے مجھ کو پھر کوئی موقع حاجی صاحب کے دیکھنے کا نہیں ملا۔ حاجی صاحب مسلمان تھے اور وہ اہل حدیث تھے۔ جو لوگ کہ حدیث و قرآن پر عمل کرتے ہیں اور کسی خاص امام یا مجتہد کی پیروی نہیں کرتے، یعنی تقلید نہیں کرتے، وہ لوگ اہل حدیث کہلاتے ہیں۔ جب فقہ و حدیث میں اختلاف ہوتا ہے تب اہل حدیث حدیث کی سند کو مانتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ ہر ہر واقعہ میں ان کا کیا عمل تھا، مگر جہاں تک ظاہر ان کے حالات تھے وہ حدیث کی پیروی کرتے تھے۔ شیخ محمد بھی اہل حدیث کے عقیدہ پر تھے۔

میں ٹھیٹھ مسلمان ہوں سچی بات کی پیروی کرتا ہوں اور کسی خاص طریقہ کا مثلاً اہل حدیث شافعی یا حنفی وغیرہ کا سر سے پاؤں تک پابند نہیں ہوں۔ جہاں اختلاف حدیث و فقہ کا ہوتا ہے وہاں کبھی حدیث اور کبھی فقہ کو مانتا ہوں۔ مجھ کو قرآن و حدیث سے واقفیت ہے (اس سوال پر وکیل مدعا علیہم نے اعتراض کیا۔ سوال۔ مطابق اصول حدیث و قرآن شریف کے منجملہ ورثاء کے ایک وارث کو کل جائداد اپنی کا جزو کثیر دینا اور خفیف جائداد رکھ چھوڑنا جائز ہے یا نہیں، یعنی ایک وارث کو دینا اور دوسرے ورثاء کو محروم کرنا جائز ہے یا نہیں۔ (وکیل مدعا علیہم نمبر ا نے یہ اعتراض کیا کہ یہ سوال متعلق قانون کے ہے اور کسی گواہ سے قانون کا مسئلہ نہیں پوچھا جا سکتا اور یہ بھی اعتراض ہے کہ یہ گواہ ماہر فن نہیں ہے۔ حکم عدالت یہ سوال گواہ سے بطور ماہر فن کے پوچھا جا سکتا ہے) جواب۔ اس قسم کا انتظام جائداد کا جائز نہیں ہے۔ جہاں تک مجھ کو معلوم ہے حاجی صاحب کا برتاؤ اپنے لڑکوں سے کچھ خلاف نہیں تھا۔ بجواب سوال جرح وکیل مدعا علیہ نمبر ا۔ عربی میں جتنے فنون ہیں اور جو عموماً پڑھائے جاتے ہیں ان کو میں نے پڑھا ہے میں نے مجسطی و تشریح الافلاک نہیں پڑھا ہے۔ ایم اے تک کے کورس کی جس قدر کتابیں عربی و فارسی میں پڑھائی جاتی ہیں میں نے پڑھا ہے۔ میں بحیثیت پروفیسر کے فقہ و حدیث کو نہیں پڑھاتا ہوں۔ میں نے فقہ شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی . . . . . اور مولوی عبدالحیٔ ساکن فرنگی محل شہر لکھنؤ و مولوی فیض الحسن پروفیسر لاہور اورینٹل کالج سے پڑھا تھا۔ مولوی فیض الحسن صاحب حنفی مقلد ہیں۔ مولانا عبدالحیٔ صاحب بھی مقلد تھے مگر وہ سخت نہیں تھے۔ مولوی شبلی صاحب کے نام کے ساتھ جو نام نعمان کا ہے وہ امام ابوحنیفہ کا نام تھا۔ مولوی شبلی مقلد ہیں مگر سخت نہیں ہیں۔ میں نے علم حدیث

ان استادوں سے یا اور کسی سے نہیں پڑھا۔ لیکن میں نے اس کو خود بخود پڑھا۔ سوال۔ عموماً لوگ فن حدیث استاد سے پڑھتے ہیں جواب۔ وہ لوگ جو خود بخود حدیث مطالعہ کرتے ہیں وہ اکثر استاد سے پڑھنے والوں سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔ مجھ کو فن حدیث کی کوئی سند نہیں ملی ہے۔ میں نے اصول حدیث استاد سے نہیں پڑھا ہے۔ سوال۔ فن حدیث کے جاننے کے لیے علم رجال کی ضرورت ہے یا نہیں۔ جواب۔ فن حدیث کے جاننے کے لیے علم رجال کی ضرورت ہے۔ سوال۔ علم رجال آپ نے کسی استاد سے پڑھا ہے یا نہیں۔ جواب۔ نہیں۔ یہ استاد سے پڑھنے کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اس مضمون پر بہت سی کتابیں ہیں۔ فن حدیث کی بھی بہت سی کتابیں ہیں۔ خاص خاص حدیثوں کے مستند ہونے میں و غیر مستند ہونے میں علمار محدثین اختلاف کرتے ہیں۔ حدیثوں کے مضمون بیان کرنے میں کہیں کہیں علمار کا اختلاف ہے۔ محدثین نے بلکہ مجتہدین نے جہاں اہل حدیث سے اختلاف کیا ہے وہاں یا تو حدیث کے معنی اور طور پر کیے ہیں یا کسی اور حدیث کو اس حدیث پر ترجیح دی ہے یا اس حدیث کو انھوں نے غیر ثابت سمجھا ہے یا ان کو حدیث نہیں ملی ہے اور اس طرح پر محدثین بھی کرتے ہیں۔ حدیث کی چھ مشہور و صحیح کتابوں کو میں نے اکثر مطالعہ کیا ہے اور ان کے علاوہ اور کتابوں کو بھی دیکھا ہے میں نے حدیث کی کئی کتابوں کی نقل کیا ہے۔ وہ کتاب امام بخاریؒ کی جو سب سے زیادہ مستند کتاب حدیث میں ہے جس کی رو سے ہبہ ایک وارث کو بمحرومی دیگر وارث کے ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ امام بخاری نے اپنی کتاب میں یہ نہیں لکھا ہے کہ میری بعض حدیث غیر صحیح ہیں۔ سوال۔ آیا امام بخاری نے اپنی کتاب میں یہ لکھا ہے یا نہیں کہ جس قدر حدیثیں میں نے جمع کی ہیں وہ خواہ مخواہ صحیح نہیں ہیں جو میں نے سنا ہے وہ جمع

کیا ہے۔ جواب۔ انھوں نے ایسا نہیں لکھا ہے۔ مجھ کو یاد نہیں ہے کہ اس بارہ میں امام مسلم کی کتاب میں کچھ لکھا ہوا ہے یا نہیں، یعنی ہبہ کے بارہ میں۔ سوال۔ جو باب امام بخاری میں جو حدیث اس کے متعلق ہے اس کے معنی و تعبیر میں مابین علمار کے یہ اختلاف ہے کہ نہیں یعنی بعض علمار کی یہ رائے کہ ہبہ جائز ہے مگر مکروہ ہے اور بعض علمار کی یہ رائے کہ جائز نہیں ہے۔ جواب۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ابوحنیفہ کی یہ رائے ہے، ہبہ جائز ہے مگر کرنے والا گنہگار ہے اور اہل حدیث اور دیگر مجتہدین اس کے خلاف ہیں۔ حنفی مذہب میں امام ابوحنیفہ کا قول بطور قانون کے تسلیم کیا گیا ہے۔ سوال۔ آپ فن حدیث میں ماہر ہیں یا نہیں۔ جواب۔ اگر ماہر سے یہ مراد ہے کہ اس فن میں اعلیٰ درجہ کا مستند ہے تو اس کا مجھ کو دعویٰ نہیں ہے۔ اگر یہ مطلب ہے کہ اس فن سے واقفیت ہے جیسا کہ ایک عالم رکھ سکتا ہے، اگر یہ مراد ہے تو میں ہاں کہہ سکتا ہوں۔ سوال۔ آپ نے اس مسئلہ کے تحقیق کرنے کے لیے خاص طور پر سوال قائم کرکے اور کتابیں جمع کرکے اس سوال کو طے و حل کیا آپ کے خیال میں یہ مسلمہ رہا۔ جواب۔ میں نے اس مسئلہ پر اچھی طرح غور کیا اور اس کے متعلق اس قدر سندیں دیکھیں جتنی اس کے لیے ضروری و کافی تھیں۔ میں نے اپنی رائے بعد غور کرنے کتابوں کے، چھ سات برس ہوا قائم کیا۔ نورالانوار، کشف الاسرار، بخاری و قرآن شریف کی کتابیں میں نے اس مسئلہ پر دیکھا تھا۔ قرآن شریف میں ایک خاص آیت اس مسئلہ پر ہے۔ اس آیت کے معنی میں ممکن ہے کہ مابین علمائے اختلاف ہو۔ علاوہ قانون حنفی کے اہل حدیث کے ساتھ جداگانہ قانون ہے۔ مگر جہانتک مجھے معلوم ہے سرکار انگریزی نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ ہم نے پوری پوری قرآن کی تفسیر کسی استاد سے نہیں پڑھی ہے اور نہ میں نے کوئی سند اس کی حاصل۔

کیا ہے۔ قرآن شریف کے کچھ حصے تفسیر کے عام طور سے مدرسہ میں پڑھائے جاتے ہیں۔ بیضاوی شریف و کشاف کو میں نے کسی استاد سے نہیں پڑھا ہے۔ بہ اہتمام عدالت کے لکھا گیا اور گواہ نے سن کر تصدیق کیا۔ حکم ہوا کہ گواہ کل بتاریخ ۲۱ جون ۱۹۱۶ء حاضر ہو۔ مرقوم ۲۰ جون ۱۹۱۶ء۔

مولوی حمید الدین۔ بحلف بسلسلہ دیروزہ تاریخ ۲۱ جون ۱۹۱۶ء۔ بجواب سوال وکیل مدعا علیہ نمبر ۱۔

منجملہ چھ کتابوں کے حدیث کی دو کتاب حدیث کی زیادہ تر مستند و صحیح ہیں جن کے نام بخاری و مسلم ہیں، یعنی صحیح بخاری و صحیح مسلم ہیں۔ ان دو میں بخاری زیادہ مستند ہے۔ شرح مسلم کی امام نووی سے ہے۔ امام نووی ایک قابل اور بڑے عالم سمجھے جاتے ہیں۔ یہ شرح پرانی کتاب ہے۔ سوال۔ صحیح مسلم میں جلد ۲ صفحہ ۳۰ طبع نولکشور یہ حدیث ہے کہ ایک شخص نے اپنے ایک لڑکے کو ایک غلام دیا اور اس کے بعد پیغمبر صاحب سے یہ خواہش کی کہ آپ اس پر گواہی کر دیں اور پیغمبر صاحب نے یہ سوال پوچھا کہ تم نے اس کے مثل اپنے اور لڑکوں کو بھی دیا ہے تب اس شخص نے جواب دیا کہ نہیں تب پیغمبر صاحب نے یہ کہا کہ بجز ہمارے اور شخصوں کی گواہی کراؤ۔ جواب۔ جس حدیث کا یہ ٹکڑا ہے وہ حدیث ہے۔ سوال۔ امام نووی نے اس حدیث کی شرح میں یہ لکھا ہے کہ مذہب امام شافعی و امام مالک و ابو حنیفہ کا یہ ہے کہ ہبہ مکروہ ہے حرام نہیں ہے اور ہبہ صحیح ہے۔ جواب۔ امام نووی نے یہ لکھا ہے۔ سوال۔ نووی میں یہ لکھا ہے کہ جور وہ ہے جو اعتدال سے خارج ہو، وہ عام اس سے کہ مکروہ ہو یا حرام۔ جواب۔ ہاں لکھا ہے۔ مکروہ کی دو قسم ہیں۔ ایک تنزیہی اور دوسری تحریمی۔ ایک دوسری روایت میں یہی حدیث اس طور پر ہے کہ میں جور پر گواہی نہیں دینا چاہتا۔ اس حدیث کی شرح میں امام نووی نے یہ لکھا

ہے کہ جور کے معنی یہاں یعنی اس حدیث میں مکروہ تنزیہی ہے نہ کہ تحریمی اور اس حدیث کی رو سے بعض اولاد کو ہبہ کرنا علاوہ دوسری کے صحیح ہے۔ اس کتاب کے حاشیے پہ لکھا ہے۔ (باب کراہت تفضیل بعض الاولاد فی الہبۃ) مگر یہ الفاظ اصل کتاب امام مسلم میں نہیں ہے۔ مگر شرح نووی میں یہ الفاظ ہیں۔ عام طور پر درس نظامیہ میں بخاری و مشکوٰۃ شریف حدیث میں، اور کچھ حصہ بیضاوی اور کچھ حصہ کشاف کا تفسیر میں داخل ہے۔ جو لوگ غیر مقلد ہیں وہ نہ شخصی تقلید کو اور نہ نفس تقلید کو مانتے ہیں۔ سنی لوگ عقائد میں امام اشعری اور امام ماتریدی کی پیروی کرتے ہیں۔ عقائد ایک علیحدہ شاخ مذہبی علوم میں ہے اور ایک مستقل فن ہے۔ عقائد میں حنفی و شافعی کی جداگانہ کتابیں ہیں۔ مذہب کی مختلف شاخیں صرف عقائد کے اختلاف سے نہیں پیدا ہوتیں بلکہ اعمال کے اختلاف سے بھی، چنانچہ حنفی و شافعی و اہل حدیث میں زیادہ تر اختلاف اعمال کا ہے نہ عقائد کا۔ حاجی سلیم صاحب حج کو تشریف لے گئے تھے اور بعد کو کچھ دنوں تک وکالت چھوڑ دی تھی۔ حاجی سلیم صاحب نے دو مرتبہ حج کیا تھا اور حج سے واپس آنے پر دونوں مرتبہ وکالت کچھ دنوں کے لیے چھوڑ دیا۔ پہلی مرتبہ کے متعلق مجھ کو ایک دھندلا سا خیال ہے مگر دوسری مرتبہ کے متعلق خوب یاد ہے کہ انھوں نے وکالت کچھ دنوں کے لیے چھوڑ دی تھی۔ تخمیناً چند سال، یعنی دو ڈھائی سال تین سال تک انھوں نے وکالت چھوڑ دیا تھا۔ حاجی صاحب متعدد مرتبہ لکھنؤ علاج کرنے کے لیے گئے تھے۔ حاجی صاحب کو گردہ کی بیماری کی شکایت تھی۔ مجھے نہیں معلوم ہے کہ پہلی مرتبہ وہ کب لکھنؤ علاج کرنے گئے تھے۔ میں کچھ تخمینہ بھی اس کا نہیں کر سکتا۔ مجھے ان کے کسی مرتبہ لکھنؤ جانے کے وقت کا تعین کرنے کے لیے کوئی واقفیت نہیں ہے۔ میں نے سنا کہ صدر الدین نے

حاجی سلیم کے بمقابلہ شفع کیا تھا۔ مجھ کو یہ نہیں معلوم کہ اس نالش شفع کے پہلے حاجی صاحب لکھنؤ گئے تھے یا نہیں۔ وہ لکھنؤ اکثر جایا کرتے تھے۔ حاجی صاحب کو گردہ کی بیماری کی شکایت مدت سے تھی۔ میں نے سُنا ہے گردہ کی خرابی سے البومین کا مادہ خارج ہوتا ہے۔ جب وہ لکھنؤ علاج کے لیے جاتے تھے تو علاوہ ڈاکٹر عبدالرحیم کے کسی اور طبیب یا ڈاکٹر کے زیر علاج ہونا ان کا مجھے نہیں معلوم ہے۔ جب میں مکان پر تعطیل میں سال میں ایک یا دو بار آتا تو حاجی سلیم صاحب سے مجھ سے ملاقات ہوتی تھی۔ ان کے انتقال سے دو سال پہلے بھی مجھ سے غالباً ملاقات ہوئی تھی، جہانتک مجھے یاد ہے۔ مجھ کو یاد نہیں ہے کہ اس وقت ان کو گردہ کا دورہ تھا یا نہیں۔ ان کو مدت سے درد گردہ کا دورہ ہوا کرتا تھا۔ اس سے پہلے سے ان کو درد گردہ کا دورہ مدت سے ہوا کرتا تھا۔ الہ آباد میں میرے پاس جب وہ اخیر مرتبہ مقیم تھے ان کے وارد ہونے کی تاریخ چند ماہ بقرعید سے پہلے تھی، چند ماہ کے معنی ایک مہینہ سے زیادہ اور دو ڈھائی مہینہ تک ہے۔ ان کے قیام کے زمانہ میں محمد ان کے ساتھ برابر رہتے تھے۔ مگر کسی خاص ضرورت کے لیے جو غالباً اس معاملہ کے متعلق تھی جو ان کے پیش نظر اس زمانہ میں تھا، اسکے لیے چند روز کے واسطے جو غالباً کم و بیش ایک ہفتہ ہوگا مکان پر گئے تھے۔ (یہ جواب گواہ نے اس سوال پر دیا کہ محمد اپنے باپ کے پاس برابر رہتے جب وہ میرے یہاں مقیم تھے یا کچھ دنوں رہتے اور پھر چلے جاتے تھے۔) جب تک میرے مکان پر حاجی سلیم صاحب تھے جہاں تک مجھے معلوم ہے، ان کے ہوش و حواس و عقل درست تھے۔ ان کی قابلیت معاملہ فہمی جیسی کہ صحت کی حالت میں تھی بظن غالب اس سے کچھ کم رہی ہوگی۔ جب وہ میرے مکان پر مقیم تھے تو وہ چند بار، جہاں تک مجھے معلوم ہے، مسٹر عبدالرؤف ماسٹر[2] کے یہاں تشریف لے گئے۔ میرے مکان سے مسٹر محمد اسحاق وکیل[1] ہائی کورٹ کے مکان پر وہ چند بار پیدل گئے تھے۔ میرے مکان سے وہ مقام جہاں گاڑی سوار ہونے کے لیے کھڑی ہوتی ہے، تخمیناً تیس چالیس قدم ہے، ممکن ہے کہ اس سے کچھ زیادہ یا کچھ کم ہو۔ مکان سے گاڑی تک جانے کے لیے جب کبھی وہ جاتے تھے تو اپنے قدم سے جاتے تھے۔ حاجی صاحب جہاں آرام کرتے تھے وہاں سے پائخانہ کا گھر تخمیناً بیس قدم کے فاصلہ پر یا کچھ کم و بیش ہوگا اور اپنے آرام کی جگہ سے پائخانہ تک اپنے پاؤں سے جاتے تھے اور اپنے پاؤں سے آتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ حاجی صاحب اس زمانہ میں بضرورت دائر کرنے اپیل بمقابلہ صدرالدین گئے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ میرے مکان میں مقدمات کے کاغذات نہیں دیکھتے تھے، جب تک کہ میں ان کے پاس رہتا تھا۔ الہ آباد سے مکان پر واپس آنے کے بعد جہاں تک مجھے معلوم ہے ان کی بیماری بڑھتی گئی (یہ جواب گواہ نے اس سوال پر دیا آپ کو اور مکانوں کی اطلاع، بعد واپسی حاجی صاحب کے الہ آباد سے ہوئی یا نہیں) پھرہا کا حاجی صاحب کا مکان میں نے دیکھا ہے۔ اس مکان کی مالیت کا تخمینہ میں نہیں کر سکتا۔ جہاں تک مجھ کو یاد ہے حاجی صاحب سے جو گفتگو ان کے میرے درمیان میں بطور راز کے ہوئی تھی اس کی اطلاع میں نے کسی کو نہیں دی۔ میری بی بی مولوی سعید صاحب کی حقیقی بھتیجی ہے۔ مرزا صدرالدین و حاجی سلیم صاحب کے درمیان مقدمات تھے جس میں مولوی سعید صاحب صدرالدین کے وکیل و طرفدار تھے۔ مگر حاجی صاحب کے انتقال

---

[1] یہ غالباً بیرسٹر ہوگا، موصوف کا تعلق محمد آباد گہنہ کے ایک معزز گھرانے سے تھا، آگے چل کر وہ الہ آباد اور پنجاب ہائی کورٹ کے جسٹس ہوئے۔ [2] مولانا شبلی کے چھوٹے بھائی۔

کے بعد درمیان صدر الدین و محمد کے جو مقدمہ تھا اس میں بھی مولوی سعید صاحب صدر الدین کے طرفدار تھے۔ یہ مقدمہ جس میں میرا اظہار ہو رہا ہے اس میں بھی مولوی سعید صاحب، جہانتک میں نے سنا ہے، مدعا علیہ کے طرفدار ہیں۔ میری بی بی مولوی شبلی صاحب کی بہن کی لڑکی ہیں۔ بجواب سوال مکرر وکیل مدعیہ۔ مسٹر محمد اسحاق صاحب وکیل ہائی کورٹ مولوی شبلی صاحب کے حقیقی بھائی ہیں۔ سوال۔ مسٹر اسحاق کی لڑکی محمد اقبال[1] سے بیاہی ہے۔ اس جگہ پر مسٹر اقبال وکیل مدعا علیہ نے اعتراض کیا کہ یہ سوال . . . ہے۔ عدالت نے یہ سوال اس بنیاد پر منظور کیا کہ اگر فریقین سے رشتہ داری ہے تو اس کو مثل میں ہونا چاہیے) جواب۔ ہاں۔ مسٹر مہدی حسن کی لڑکی، جو مسٹر اسحاق کے دوسرے بھائی ہیں محمد مدعا علیہ سے بیاہی ہے۔ سوال۔ علاوہ وکالت کے مسٹر اقبال محمد مدعا علیہ کے طرفدار ہیں آپ جانتے ہیں (اس سوال پر مولوی محمد عثمان وکیل مدعا علیہ نمبر ۱ نے اعتراض کیا لیکن عدالت نے اس وجہ سے منظور کیا کیونکہ گواہ سے ایسے قسم کا سوال کرنے کی، جرح کے اخیر میں اجازت دی گئی ہے۔) جواب۔ جہانتک مجھے معلوم ہے میں ہاں کہہ سکتا ہوں۔ سوال۔ جس وقت شیخ محمد حاجی صاحب مرحوم کی وفات کے بعد اپنے مقدمات کی پیروی کے لیے الٰہ آباد جاتے تھے تب کہاں ٹھہرتے تھے۔ جواب۔ محمد اور ان کے فریق صدر الدین بوجہ اس رشتہ کے جو دونوں کو میرے ساتھ ہے دونوں میرے ہاں ٹھہرتے تھے۔ ہندوستان میں جو عربی تعلیم کے مدرسہ ہیں ان میں بالعموم طلبہ کو سند دی جاتی ہے۔ میں نے کسی ایک مدرسہ میں اپنی تعلیم پوری نہیں کی ہے۔ اخیر جس

---

[1] مولانا شبلیؒ اور مولوی اسحاق کے خاندانی عزیز اور چچیرے بھتیجے تھے جو بعد میں ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہوئے۔

مدرسہ میں میں نے تعلیم پائی اس میں زیادہ تر اس کے مشہور پروفیسر سے، علاوہ اوقات مدرسہ کے، گھر پر سبق پڑھتا تھا اور وہ تعلیم بالکل پرائیویٹ طور پر تھی، جس کی رو سے انھوں نے اپنے کسی شاگرد کو جس میں مولوی حالی صاحب تھے، سند نہیں دی۔ امام نووی شافعی ہیں، جہاں تک مجھ کو معلوم ہے اور اس ہبہ کے متعلق جس کا ذکر حدیث مذکور میں آیا ہے اس کے جواز پر علماء متفق نہیں ہیں۔ چار مشہور مجتہدین میں سے تین اس کے موافق ہیں اور مشہور مجتہدین میں سے ایک شخص جو کہ اہل حدیث کا بڑا مشہور ہے اور دیگر محدثین جن کا نام امام نووی لکھا ہے اس کے خلاف ہیں۔ سوال۔ جواز ہبہ کی نسبت جو بحوالہ حدیث مذکور سوال جرح میں نسبت امام نووی صاحب کے آپ سے پوچھا گیا ہے اسکی نسبت میرا یہ سوال ہے کہ آیا اس ہبہ سے یہ مراد ہے کہ واہب اپنی جائداد کو کسی ایک اولاد کے حق میں اس طور سے ہبہ کر دیوے کہ جس کی وجہ سے دیگر ورثاء بالکل قطعاً محروم ہو جاویں یا ان کو اس قدر جزو قلیل ملے کہ برابر محرومی کے ہو یا اس سے یہ مراد ہے کہ محض ہبہ کرنا کسی ایک اولاد کو باستثناء دیگر ورثاء کے، جس سے دیگر ورثا کی محرومی نہ ہو جائز ہے، یا نہیں (اس پر مولوی محمد عثمان وکیل مدعا علیہ نے اعتراض کیا کہ یہ سوال .... اور میرے سوال جرح میں کوئی ابہام نہیں تھا اور یہ متعلق امر قانونی ہے جو گواہ سے نہیں پوچھا جا سکتا۔ حکم عدالت۔ یہ سوال حسب دفعہ ۱۹۰ قانون شہادت پوچھا جا سکتا ہے ...... نہیں ہے) جواب۔ میرے خیال میں جو حدیث امام نووی کی سوال جرح میں ذکر کی گئی ہے اس سے مراد ایسا ہبہ ہے جس میں بالکل مساوات درمیان اولاد کے ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے اور بہت تھوڑا سا ایک کو دوسرے پر ترجیح دی گئی ہے، اس سے مراد ہرگز وہ ہبہ نہیں ہے جس سے ایک ولد کو تمام جائداد دی

ئے اور دیگر اولاد کو بالکل محروم کر دیا جائے۔ مسٹر محمد اسحاق کا مکان میرے مکان سے تیس چالیس قدم یا قریب اس کے ہوگا۔ صبح کے وقت کبھی کبھی کالج جانے سے پیشتر حاجی صاحب کی خدمت میں میں ہوتا تھا، مگر اکثر اس وقت میں میں ان کی خدمت سے غیر حاضر رہتا تھا۔ کالج سے آنے کے بعد جو کہ ایک یا دو بجے ہوتا تھا اس وقت سے اور سونے کے وقت تک اکثر میں ان کی خدمت میں ہوتا تھا اور بہت کم غیر حاضر رہتا تھا جب کہ وہ میرے مکان پر ہوتے تھے۔ نو بجے رات کے قریب ہم دونوں سوتے تھے۔

باہتمام عدالت کے لکھا گیا اور اس کو سن کر گواہ نے تصدیق کیا۔[لہ]

گواہی کا یہ بیان کل ۱۱ ورق یعنی ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ فولسکیپ سائز کے کاغذ کے دونوں طرف سیاہ روشنائی سے سرکنڈے کے قلم سے لکھا گیا۔ ہر ورق کی پشت والے صفحے پر آخری سطر کے بعد سب سے نیچے مولانا کے، وکلاء کے، اور صاحب عدالت افسر کے دستخط ثبت ہیں، جو انگریزی میں ہیں۔ اس طرح کل ۱۱ + ۱ = ۱۲ (بارہ) جگہ مولانا کے دستخط ثبت ہیں۔ ۱۱ ورقوں کے علاوہ ایک دستخط اس جگہ ہے جہاں تاریخ بدلی ہے اور بیان اگلے روز پر ملتوی کیا گیا ہے۔

لہ ۲۰ فروری کو مولانا فراہی کا بیان حلفی مدرستہ الاصلاح و دائرۂ حمیدیہ کے ناظم مولانا بدرالدین اصلاحی نے پڑھا۔ میں نے انکے ساتھ بیٹھ کر اپنی ہاتھ کی نقل کا موازنہ کیا۔ اس طرح پر کہ اصل مولانا بدرالدین صاحب اپنے ہاتھ میں لیکر پڑھتے گئے اور میں نقل کو دیکھتا گیا۔ بعض مقامات پھر بھی لاینحل رہے یا کٹ جانے کیوجہ سے نہیں پڑھے گئے لیکن جو حصے پڑھے گئے وہ اب بالکل درست ہیں۔ دائرۂ حمیدیہ کے ناظم اور راقم کی اس کاوش کے بعد اس نقل کو مطابق اصل کہا جاسکتا ہے اور اس میں غلطی کا بہت کم شائبہ رہ گیا ہے۔

ہر جگہ مولانا نے حسب معمول پورا نام واضح اور صاف صاف دستخط میں تحریر کیا ہے۔ یہ نام ہر جگہ حمید الدین ہے جس کی املا انگریزی میں یہ ہے Hamiduddin۔

یہ بیان سرکاری کاغذ پر ہے جس کے صفحے پر ابتدا میں کچھ اندراجات چھپے ہوئے ہیں اور کچھ منشی کی طرف سے پر کیے گئے ہیں۔ ان صفحات میں ہر جگہ منشی نے اردو میں مولانا کا نام حمید الدین درج کیا ہے پہلے صفحے پر مکمل اندراجات ہیں جب کہ باقی صفحات پر صرف مقدمہ نمبر، نام فریقین، نام گواہ اور تاریخ کا اندراج ہے۔ اس بیان میں اور دیگر اندراجات میں مولانا کے گاؤں کا نام ہر جگہ پھریہا لکھا گیا ہے اور مولانا کی قومیت شیخ لکھی گئی ہے اور عمر ۴۸ سال ظاہر کی گئی ہے۔ مولانا کی قومیت انصاری کی بجائے شیخ لکھنا بعض سوالات پیدا کرتا ہے۔

اس بیان کی تحریر خاصی صاف اور بہتر ہے۔ پھر بھی بعض مقامات پڑھے نہیں جاسکے۔ کاغذ کی بوسیدگی کیوجہ سے کہیں کہیں بیان کٹ بھی گیا ہے۔ جہاں جہاں تحریر میں کوئی اضافہ یا قلم زد کیا گیا ہے وہاں انگریزی میں لکھنے والے یا متعلقہ افسر کا دستخط Initial ضرور کر دیا گیا ہے۔

یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مولانا کا اصل بیان اردو میں تھا یا کسی اور زبان میں تھا جس کو اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ بیان کے اختتام پر آخر صفحہ ۲۲ (ورق ۱۱) پر سرخ روشنائی سے انگریزی میں ایک اندراج ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ترجمہ ہوا ہے لیکن یہ نہیں واضح ہوتا کہ ترجمہ کس زبان سے کس زبان میں اور کیوں کیا گیا۔

معارف کی ڈاک

مکتوب لاہور

لاہور ۴ نومبر ۱۹۹۱ء مخدوم و محترم

السلام علیکم۔ مزاج گرامی۔ اکتوبر کا معارف اور آپ کا گرامی نامہ کل ہی ایک ساتھ ملے۔ شکریہ، لیکن ستمبر کے شمارے کا تا حال انتظار ہے، شاید یہ شمارہ محکمہ ڈاک کی بدنظمی کی نذر ہو گیا ہے۔ بہرحال ستمبر کا شمارہ دوبارہ بھجوا دیں۔

گذشتہ ہفتے ترکی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی چوتھی جلد موصول ہوئی اس میں حرف او ع کے علاوہ ب سے شروع ہونے والے مقالات ہیں۔ ترک، عرب اور ایرانی مشاہیر کے علاوہ جن ہندی علماء، فضلاء پر مضامین ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

عین الملک ملتانی، آزاد بلگرامی، عظیم آبادی (محمد شمس الحق ڈیانوی شارح سنن ابی داؤد، اس میں راقم السطور کے مقالے مندرجہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کا بھی حوالہ ہے) عزیز احمد حیدرآبادی (متعدد انگریزی کتابوں کے مصنف) بابر، بابر نامہ، بابر کے جانشین، بہادر شاہ ظفر، بہادر شاہ گجراتی، خواجہ بہاء الدین ذکریا ملتانی، بحر العلوم لکھنوی، خواجہ باقی باللہ دینی مقالات میں آیۃ الکرسی، عزرائیل، عین الیقین اور سورۂ بقرہ قابل ذکر ہیں۔ عشق کے تحت علم تصوف کی تاریخ آگئی ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد پر مقالہ کسی اگلی جلد میں آئے گا۔

ترک خطاطوں کی خطاطی کے نمونے نہایت دلکش اور نظر افروز ہیں بعض نامور مصنفوں کی قلمی تصانیف کا عکس بھی شامل ہے۔ مساجد، مقابر اور محلات کی تصویریں بھی دیدہ زیب ہیں۔

احباب سلام قبول فرمائیں۔ فقط والسلام

دعاگو (شیخ) نذیر حسین

مکتوب کلکتہ

محترم جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب السلام علیکم

امید کہ بخیر و عافیت ہوں گے اور دار المصنفین ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا۔ آج خط لکھنے کا محرک میری ایک تجویز ہے جو عرصے سے دماغ میں گھوم رہی ہے مگر آپ کو اپنی مشغولیتوں کی وجہ سے نہ لکھ سکا۔

چونکہ اسلام ایک عالمی مذہب ہے اور تمام انسانوں کے لیے رحمت ہے۔ اس لیے مسلمان بھی ایک عالمی برادری ہیں۔ اسلام میں وطنیت یا وطن کی وہ اہمیت نہیں جیسا کہ آج کل لوگ مغربی پروپیگنڈے کی وجہ سے دے رہے ہیں۔

موجودہ دور میں جمال الدین افغانی نے اسلامی برادری پر زور دیا، مگر ان کو Pan Islamisim کے حامی کہہ کر بدنام کیا گیا۔ افسوس کہ اردو میں ان پر کوئی اچھی مدلل کتاب نہیں ہے جس میں ان کے مضامین اور رسالوں اور تقریروں کو سامنے رکھ کر اسلامی نقطۂ نظر سے ان پر تبصرہ کیا گیا ہو۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ایسی کتاب کی سخت ضرورت ہے خاص طور سے فی الحال جبکہ کمیونسٹ تحریک کا زوال یقینی ہے اور مشرق وسطیٰ مع ترکستان میں احیائے اسلام کی لہر کا بڑا امکان ہے۔

اگر آپ اور مجلس ادارت کو یہ تجویز پسند ہو تو اس کے لیے اخراجات کی تفصیل سے آگاہ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ میں اپنے مریضوں، احباب و اقارب سے اس کے لیے معقول انتظام کر سکوں۔

ہر پرسایان حال کو سلام۔ والسلام۔ خاکسار مقبول احمد[1]

[1] معارف: مکتوب نگار ایک کامیاب ڈاکٹر اور لائق پروفیسر ہیں جو دینی ذوق رکھنے کے علاوہ اجتماعی و ملی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔

مکتوب احمد آباد

۹-۱۱-۱۹۹۱

مکرمی جناب مدیر "معارف" السلام علیکم

معارف کے ستمبر کی اشاعت سے علامہ ابو ظفر ندوی صاحب کی مطبوعات کے بارے میں آپکا نوٹ ملاحظہ کیا۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ مولانا صاحب کی دو کتابیں تو مولوی مسعود علی ندوی کے زیر اہتمام معارف پریس اعظم گڈھ سے شایع ہوئی ہیں۔ ۱۔ تذکرۂ اقدس ۱۹۳۴ء ۲۔ تحفۃ المجالس ۱۹۳۹ء۔ اول الذکر حضرت پیر محمد شاہؒ (متوفی ۱۱۶۳ھ) کی سوانح حیات ہے جبکہ تحفۃ المجالس حضرت شیخ احمد کھٹوؒ مغربی کے ملفوظ کا ترجمہ ہے۔

انکے علاوہ مولانا صاحب نے "برہما کا سفر نامہ" اور برہمی بول چال پر بھی تالیفات سپرد قلم کیے ہیں جو شایع ہو چکے ہیں۔

گجرات کی مشہور تاریخ مراۃ احمدی کے تتمہ کا تاریخ اولیاء گجرات کے نام سے اردو ترجمہ آپ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو احمد آباد سے شایع ہوا تھا اور اب جسے گجرات اردو اکاڈمی دوبارہ شایع کر رہی ہے۔

اسی طرح مولانا صاحب کے اور بھی کئی مسودات کا علم ہے اور جنھیں خود میں نے مولانا صاحب کی تحویل میں دیکھا بھی تھا مگر اب انکے بارے میں کوئی علم نہیں ہو سکا۔

اگرچہ خود میں نے مکرمی ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی صاحب کی معیت میں پٹنہ جا کر بھی معلوم کیا مگر کامیابی نہ ہوئی۔

انشاء اللہ آپکے مزاج گرامی بخیر و عافیت ہونگے۔ "تذکرۂ اقدس" اور "تحفۃ المجالس" کی ایک ایک نقل روانہ کر رہا ہوں۔

(پروفیسر محی الدین بمبئی والا)

ادبیات

خمسۂ نعت

از محمد عبدالرحمن سعید صدیقی

ضمیر کی ہے صدا مدحتِ رسولؐ لکھوں ۔۔۔ عقیدتوں کے خیاباں سے تازہ پھول چنوں
پھر ان کو قلزمِ اخلاص سے نمو دیدوں ۔۔۔ حضورِ ذاتِ رسالت میں ہدیہ پیش کروں
میں حقِ نعت ادا کر سکوں تو کیسے کروں؟

میں ایک خاک نشیں سدرہ ہے مقام انکا ۔۔۔ وہ بعد سیرِ فلک عرش پر قیام ان کا
یہ نقطۂ عروج کہ حق سے ہوا کلام ان کا ۔۔۔ رقم میں لیلۃ اسریٰ کی روداد کروں
میں حقِ نعت ادا کر سکوں تو کیسے کروں؟

تمھارے عشق کے دعوے کی جرأت گفتار ۔۔۔ نہ سوزِ قلب حزیں اور نہ خوبیٔ کردار
عمل کی روح ہے خفتہ زبان پر اشعار ۔۔۔ خرد کے سحر کا افسوں نہ حشر خیز جنوں
میں حقِ نعت ادا کر سکوں تو کیسے کروں؟

وہ شانِ شوکت عالی یہ فقر کا عالم ۔۔۔ بساطِ قیصر و کسریٰ کو کر دیا درہم
وہ جس نے فاش کیا سرِ عظمت آدم ۔۔۔ ہے مدح جنکی صحائف میں اسکا ذکر کروں
میں حقِ نعت ادا کر سکوں تو کیسے کروں؟

قدومِ پاک سے رونق ملی زمانے کو ۔۔۔ نظام نو دیا قدرت کے کارخانے کو
بنایا مرکز اقوام حق کے آستانے کو ۔۔۔ جہاں میں ذکر محمدؐ کو سربلند کروں
میں حقِ نعت ادا کر سکوں تو کیسے کروں؟

(انوار)

مطبوعات جدیدہ

حیات مولانا گیلانیؒ از جناب مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت طباعت، عمدہ مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۳۶، قیمت ۴۰ روپیے، ناشر: مولانا یوسف اکیڈمی بنارس یوپی۔

مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم معقولات و منقولات میں یکساں درک رکھتے تھے اور ہندوستان کے طبقہ علما میں جدید افکار و خیالات اور عصری تقاضوں سے باخبری کے لیے ممتاز تھے علاوہ ازیں وہ نامور خطیب و مدرس اور ایک صاحب طرز نثر نگار کی حیثیت سے امتیازی شان کے حامل تھے، مگر افسوس ہے کہ ایسے متبحر عالم کی کوئی سوانح عمری ابھی تک مرتب نہیں کی گئی تھی، خوشی کی بات ہے کہ مولانا مفتی ظفیر الدین نے یہ کام سلیقہ سے انجام دے کر اس کمی کو پورا کر دیا ہے، وہ ایک کہنہ مشق اہل قلم ہیں اور مولانا گیلانی سے ان کو ذاتی طور پر ربط و تعلق رہا ہے، اس لیے انھوں نے اس کتاب میں مولانا گیلانی کے خاندان، تعلیم و تربیت، دارالعلوم دیوبند میں تحصیل علم اور فراغت کے بعد تلاش معاش کے مراحل، دیوبند میں خدمت تدریس اور جامعہ عثمانیہ میں علمی و دینی خدمات وغیرہ عنوانات کے تحت اہم اور جزئی تمام معلومات جمع کر دیے ہیں، ان کے علاوہ فہم قرآن، خطابت، شعر و شاعری، سیاست اور تصوف اور بعض امور و مسائل میں مولانا کے مخصوص رجحانات اور انفرادی خیالات پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اور ان کے اخلاق و عادات وغیرہ کا مرقع بھی پیش کیا ہے، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی

ندوی کے قلم سے پیش لفظ بھی ہے۔

غالب کے خطوط از جناب ڈاکٹر خلیق انجم، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ، کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۶۸، قیمت ۷۵ روپیے، ناشر: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے مرزا غالب کے خطوط کے متفرق اڈیشنوں کو یکجا کرکے جدید طرز پر حواشی اور اشاریوں کے ساتھ جس خوبی و خوش سلیقگی سے مرتب و مدون کیا ہے اسے اہل نظر نے بڑی قدر کی نظر سے دیکھا، زیر نظر مجموعہ مکاتیب غالب کا تیسرا حصہ ہے جس میں جن سترہ ۱۷ اشخاص کے نام خطوط درج ہیں ان میں نواب رامپور یوسف علی خاں ناظم اور نواب کلب علی خاں اور رامپور کے مزید چار حضرات کے نام کے وہ خطوط بھی شامل ہیں جن کو عرصہ ہوئے مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم نے 'مکاتیب غالب' کے نام سے مرتب کرکے شایع کیا تھا، منشی نبی بخش حقیر کے نام مرزا غالب کے خطوط کو کراچی سے جناب آفاق احمد آفاق نے ۱۹۴۹ء میں 'نادرات غالب' کے نام سے شایع کیا تھا، وہ بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں، ان تمام خطوط پر فاضل مولف نے نہایت تحقیق و دیدہ ریزی سے حواشی لکھے ہیں، خطوط کے ماخذ کی صراحت کے علاوہ خطوط کے عکس بھی دیے گئے ہیں، تحقیق اور حسن ترتیب کے اعلیٰ معیار نے کتاب کو ظاہری و باطنی محاسن سے آراستہ کر دیا ہے، غالبیات کے ذخیرہ میں یہ مفید اور قابل قدر اضافہ ہے۔

صحبتے با اولیاء مرتبہ جناب مولانا تقی الدین ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت، عمدہ، مجلد، صفحات ۲۱۶، قیمت درج نہیں، ناشر: دارالتالیف

دار التصنیف، جامعہ اسلامیہ مظفر پور، قلندر پور، اعظم گڈھ۔

عصر حاضر میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوری کی ذات گرامی رشد و ہدایت اور زہد و اتقا کا نمونہ تھی، ماہ رمضان کی پُرکیف اور بابرکت ساعتوں میں انکی خانقاہ کی کشش اور جاذبیت میں اور اضافہ ہوجاتا تھا اور ملک و بیرونِ ملک کے بے شمار مسترشدین مولانا کی صحبت بابرکت سے استفادہ کے لیے اس مہینہ میں وہاں جمع ہوتے تھے، بعض حاضرین اس موقع پر حضرت شیخ کی زبان فیض ترجمان سے تصوف وسلوک کے جو رموز، علمی نکات اور بزرگوں کے سبق آموز واقعات جاری ہوتے تھے ان کو قلم بند کر لیتے تھے، مولانا محمد تقی الدین ندوی مظاہری کو حضرت شیخ سے تلمذ و ارادت کے علاوہ مخصوص قرب کا شرف بھی حاصل رہا ہے، ۱۳۹۰ھ میں ان کو رمضان المبارک میں مکمل حاضری کی سعادت نصیب ہوئی اور انھوں نے تیس دن کی مجلسوں کے ملفوظات کو حرز قلم بنالیا، زیر نظر کتاب ان ہی افادات پر مشتمل ہے اور ہند و پاک سے متعدد مرتبہ شایع ہوچکی ہے، پہلے ایڈیشن کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے۔ کتاب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مقدمہ اور حضرت شیخ کے معمولات کے متعلق ان کے ایک مضمون سے بھی مزین ہے۔

فاضل بریلوی اور امور بدعت از جناب سید محمد فاروق القادری، متوسط تقطیع، صفحات ۳۱۲، قیمت ۳۰ روپیے، پتہ: رضا اکیڈمی، ۱۳۱ علی عمر اسٹریٹ، بمبئی ۳

مولانا احمد رضا خاں بریلوی مرحوم کو بدعات کا موید و موجد سمجھا جاتا ہے، زیر نظر کتاب میں کئی مروجہ رسوم و بدعات کے متعلق خود ان کی تحریروں سے ایسے شواہد پیش کیے گئے ہیں جن سے اس الزام کی تردید ہوتی ہے، کتاب گو مناظرانہ رنگ میں ہے لیکن

لہجہ عموماً نرم و شائستہ ہے اور فروعی اختلافات سے قطع نظر کرکے اتحاد و اتفاق کی دعوت بھی دی گئی ہے۔

حقیقۃ الادب و وظیفتہ فی ضوء تصریحات الادباء و النقاد (عربی) از جناب ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری، صفحات ۹۶، قیمت درج نہیں پتہ: مکتبہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، بنارس ۲۲۱۰۱۰۔

اس کتاب میں ادب کی تعریف، غرض و غایت، دین و اخلاق اور جنس سے اس کا رشتہ اور ادب و دین کی آویزش جیسے موضوعات پر ممتاز ادیبوں اور نقادوں کے نظریات و خیالات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں اکثر حوالے اردو ادیبوں اور تنقید نگاروں کی تحریروں کے دیے گئے ہیں، اس طرح عالم عرب میں ہندوستانی اور خاص طور پر اردو ادیبوں کے تعارف کی مستحسن کوشش کی گئی ہے۔

اورنگ زیب ایک نئی درشٹی (ہندی) از اوم پرکاش پرساد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۷۹، قیمت ۱۵ روپیے، ناشر: خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ۔

خدا بخش لائبریری پٹنہ کی دعوت پر پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے ایک لائق استاد ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد نے ہندی میں جو توسیعی خطبہ دیا تھا اسے اب کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے، اس میں اورنگ زیب کے حالات زندگی، تخت دہلی سے انحراف، جزیہ اور ہندوستانی سلطنت کے زوال جیسے ابواب کے تحت عالمگیر کے مغربی اور ہندوستانی نکتہ چیں مورخین کی غلط بیانیوں کا جائزہ اور احتساب بڑے سلیقہ سے لیا گیا ہے، ہندوستان کے نامور فرمانرواؤں میں مہاراجہ اشوک سے

موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ تخت و تاج کے حصول کے لیے ۱۰۰ بھائیوں کو تہ تیغ کرنے، کالنگ کی جنگ میں ایک لاکھ انسانوں کو قتل اور ڈیڑھ لاکھ کو قید کرنے، بدھ مذہب کی تبلیغ کے لیے شاہی خاندان کے افراد کے علاوہ امرائے سلطنت اور ملک کی دولت کا استعمال کرنے کے باوجود مورخین کی نظر میں وہ عظیم الشان فرمانروا ہے لیکن محمد تغلق اور عالمگیر جیسے فرماں روا بے بنیاد اور مہمل بیانات کے سبب ظالم و تنگ نظر اور ناعاقبت اندیش حکمراں قرار دیے جاتے ہیں، مقالہ نگار نے مغل سلطنت کے زوال کو ہندوستانی حکومت کے زوال سے تعبیر کیا ہے، ایک جگہ لکھا ہے کہ مندروں کو لوٹنے کا کام مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں نے کیا، گرو تیغ بہادر کے متعلق لکھا ہے کہ بھگت رتناولی اور سکھاں دے راج کے اولین ایڈیشنوں میں کہیں ذکر نہیں کہ ان کو اورنگزیب نے قتل کرایا مگر بعد کے ایڈیشنوں میں اس قسم کی عبارت کا الحاق کر دیا گیا، لائق مقالہ نگار نے بڑی محنت سے اپنی یہ تحقیق پیش کی اس کا اندازہ فہرست کتابیات سے بھی ہوتا ہے، البتہ بعض عام روایتیں بھی جگہ پاگئی ہیں، مثلاً اورنگزیب نے شہزادہ مراد کو دعوت دیکر شراب پلائی، یہ محض افسانہ ہے جیسا کہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے مقدمہ رقعات عالمگیر میں اس کی وضاحت کی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں (ہندی) خدابخش لائبریری پٹنہ کے شایع کردہ اس مختصر ہندی رسالہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق گاندھی جی، پنڈت نہرو، راجندر پرشاد، رادھا کرشنن، ڈاکٹر ذاکر حسین، مہادیو ڈیسائی، اجمل خاں اور خواجہ غلام السیدین کی بعض تحریروں کے علاوہ مولانا آزاد کی بعض شاہکار تحریروں اور خطبات کے اقتباسات دیے گئے ہیں۔

ع ۔ ص

سلسلۂ سیر الصحابہؓ

حصۂ اوّل (خلفائے راشدین) حاجی معین الدین ندوی: اس میں خلفائے راشدین کے [ذ]اتی حالات و فضائل، مذہبی اور سیاسی کارناموں اور فتوحات کا بیان ہے۔ ۴۰/-

حصۂ دوم (مہاجرین۔ اول) حاجی معین الدین ندوی: اس میں حضرات عشرۂ مبشرہ، اکابرین [...]تم و قریش اور فتح مکہ سے پہلے اسلام لانے والے صحابۂ کرامؓ کے حالات اور ان کے فضائل کا بیان ہے۔ ۴۵/-

حصۂ سوم (مہاجرین دوم) شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں بقیہ مہاجرین کرامؓ کے [ح]الات و فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

حصۂ چہارم (سیر الانصار اول) سعید انصاری: اس میں انصار کرام کی مستند سوانح عمریاں [...]ن کے فضائل و کمالات مستند ذرائع بہ ترتیب حروف تہجی لکھے گئے ہیں۔ ۳۵/-

حصۂ پنجم (سیر الانصار دوم) سعید انصاری: اس میں بقیہ انصار کرام کے حالات و فضائل، [د]رج ہیں۔ ۳۵/-

حصۂ ششم شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں چار اہم صحابۂ کرامؓ، حضرات حسنینؓ، امیر معاویہؓ [او]ر حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے حالات، ان کے مجاہدات اور باہمی سیاسی اختلافات بشمول واقعہ [کرب]لا درج ہیں۔ ۳۵/-

حصۂ ہفتم (اصاغر صحابہؓ) شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں ان صحابۂ کرام کا ذکر ہے، جو [فتح م]کہ کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے یا اس سے پہلے اسلام لاچکے تھے مگر شرف ہجرت سے محروم رہے [یا رس]ول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کمسن تھے۔ ۴۰/-

حصۂ ہشتم (سیر الصحابیاتؓ) سعید انصاری: اس میں آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات و بنات طاہرات [و ص]حابیات کی سوانح حیات اور ان کے علمی اور اخلاقی کارنامے درج ہیں۔ ۲۵/-

حصۂ نہم (اسوۂ صحابۂ اول) عبدالسلام ندوی: اس میں صحابۂ کرامؓ کے عقائد، عبادات، [اخلاق]ات اور معاشرت کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے۔ ۴۰/-

حصۂ دہم (اسوۂ صحابۂ دوم) عبدالسلام ندوی: اس میں صحابۂ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور [علمی ک]ارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ ۴۰/-

حصۂ یازدہم (اسوۂ صحابیات) عبدالسلام ندوی: اس میں صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور [علمی کا]رناموں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ۱۵/-